دعا و ذکر

کی حقیقت اور

اسمِ اعظم

مولانا وحید الدین خاں

E-mail: positivethinkersforum@rediffmail.com

ذکر کی حقیقت

ایک صاحب نے پوچھا کہ حدیث میں اذکار کی جو روایتیں ہیں' ان کی کیا حقیقت ہے اور وہ کس حد تک ضروری ہیں۔ کیا ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف اوقات میں ان اذکار کو پڑھنے کا اہتمام کرے۔ میں نے کہا کہ یہ ضروری اور غیر ضروری کا معاملہ نہیں' یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو ایمان کے بعد لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ جہاں ایمان ہوگا وہاں ذکر بھی پایا جائے گا۔ ایمان اور ذکر دونوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ممکن نہیں۔

ذکر کیا ہے۔ ذکر دراصل ایک اندرونی حقیقت کا لفظی اظہار ہے۔ آپ کو غیر معمولی خوشی ہو تو آپ بے اختیارانہ طور پر ہنس پڑتے ہیں۔ آپ کو شدید درد ہو تو بے اختیارانہ طور پر آپ کی زبان سے آہ کا لفظ نکل جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بنے' اس کا سینہ خدا کی عظمت وجلال سے بھر جائے گا' اس کی روح خدا کے کمالات کے احساسات میں نہا اٹھے گی۔ اور جب ایسا ہوگا تو بے اختیارانہ طور پر خدا کی یاد کے کلمات بھی اس کی زبان سے نکلنے لگیں گے۔ انہیں یاد کے کلمات کا نام ذکر ہے۔

جو شخص واقعۃً خدا کو پالے' اس سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم خدا کا ذکر کرو۔ ایسے شخص کیلئے تو ذکر ایک بے اختیارانہ عمل بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کو ہر مشاہدہ میں خدا کا جلال وکمال دکھائی دے گا' ہر تجربہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جائے گا۔ اس کا سینہ خدا کے احسانات کے احساس سے سرشار ہو جائے گا۔ اسکے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا کے بارہ میں خاموش رہے۔

خدا کی معرفت آدمی کے اندر ایک ربانی ہستی پیدا کرتی ہے۔ انسان کے اندر کی یہ ربانی ہستی جب لفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو اسی کا نام ذکر ہے۔

ذکر بمعنی یاد وہ سب سے بڑا نذرانہ ہے جو کوئی بندہ اپنے رب کے لئے پیش کرسکتا ہے۔ آدمی جب اپنی عبدیت کو اور اس کے مقابلہ میں خدا کی ربوبیت کو سوچتا ہے تو وہ خدا کی عظمتوں کے احساس کے نیچے دب جاتا ہے۔ خدا کے ان گنت احسانات کو سوچ کر وہ حیران رہ جاتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں جو میں اپنے مہربان اور قادر مطلق خدا کو پیش کروں۔ یہ احساسات کچھ روحانی کلمات کی صورت میں اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں' انہیں کلمات کا نام ذکر ہے۔

خدا کی یاد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو اللہ کا بہت ذکر کرو (یا ایھا الذین 'امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً' الاحزاب ۴۱) اسکا مطلب بعض لوگ یہ لیتے ہے کہ خوب زیادہ اللہ اللہ کرو۔ ''اللہ'' کا لفظ ہزاروں بار دہراؤ۔ مگر اس قسم کے ذکر کا مذکورہ آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن میں ذکر کسی قسم کی لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یاد کے معنی میں مذکورہ آیت کا مطلب ہے..... اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا (فاذکرنی اذکرکم' البقرۃ ۱۵۲) اس آیت میں خدا اپنے بندوں سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یہاں ذکر کو تکرارِ الفاظ کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ کیوں کہ خدا ایسا نہیں کرے گا کہ بندہ بندہ بار بار کہہ کر کسی کا ذکر کرے۔ یہاں ذکر لازمی طور پر یاد کے معنی میں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کا بہت زیادہ ذکر کرو (اکثروا ذکر ھا دم اللذات) اس حدیث میں بھی ذکر لفظی تکرار کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ایسا کوئی بھی نہیں کرے گا کہ بیٹھ کر موت' موت کہنے لگے۔ اس حدیث میں یقینی طور پر موت کا ذکر کرنے کا مطلب موت کو یاد کرنا ہے۔

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ قرآن پڑھتے تو لوگ ہمہ تن گوش ہوکر سنتے' ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: ابوموسیٰ کو آل داؤد کی خوش الحانی دی گئی ہے (لقد اوتی ابو موسیٰ مزماراً من مزامیر 'ال داؤد)

روایات میں آتا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت ابوموسیٰ اشعری سے ہوئی تو اکثر ان سے کہتے کہ اے ابوموسیٰ' ہمارے رب کو ہمیں یاد دلاؤ (یا ابو موسیٰ' ذکرنا ربنا عزوجل) حضرت عمر کے اس قول میں بھی ذکر کی قسم کے تکرار لفظی کے معنی میں نہیں ہے۔ یعنی حضرت عمر کی منشا یہ نہیں تھی کہ حضرت ابوموسیٰ ان کے پاس بیٹھ کر اللہ اللہ یا رب' رب کریں۔ اس فقرہ میں ذکر کا لفظ یاد کے معنی میں ہے۔ یعنی قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر ہمیں خدا کی یاد دلاؤ۔

لغت میں ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اس لفظ کا یہی مفہوم شریعت میں بھی ہے۔ ذکر سے مراد اللہ اور اس کی باتوں کی یاد ہے۔ یعنی آدمی کو خدا سے اتنا گہرا تعلق ہوجائے کہ وہ اس کے دل و دماغ میں سما جائے۔ وہ ہر موقع پر اس کو یاد آتا رہے۔

اللہ کو پالینا

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹-۱۹۷۲) اعظم گڑھ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کے خلیفہ مولانا سعید احمد صاحب مرحوم نے ایک بار حافظ صاحب قبلہ سے پوچھا کہ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر کثیر کرو (احزاب ۴۱) اس کا مطلب کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے پوچھا کہ ذکر کثیر (بہت یاد) کا اطلاق کتنے عدد پر ہوتا ہے تو لوگوں نے مختلف اعداد بتائے۔ کسی نے کہا ۲۵ ہزار بار اللہ کا نام لینا ذکر کثیر ہے، کسی نے کہا ۵۰ ہزار بار ذکر کرنا ذکر کثیر ہے۔ مگر ۲۵ ہزار یا ۵۰ ہزار تو گنتی کی حد نہیں ہیں۔ ان سے آگے بھی گنتیاں ہیں۔ اس قسم کے کسی محدود عددی نصاب کو ذکر کثیر کیسے کہا جاسکتا ہے۔ خدا لامحدود ہے، اس لئے اس کا ذکر کثیر بھی ایسی گنتی پر ختم ہونا چاہئے جو گنتی کی آخری حد ہو۔

حافظ حامد حسن علوی نے جواب دیا: ذکر کے معنی ہیں عدم نسیان۔ نہ بھولنے کی حالت۔ مثلاً ایک شخص کو حکومت کا افسر یہ حکم سنادے کہ اتوار کے دن تم کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تو اس خبر کو سننے کے بعد اگرچہ وہ آدمی روزمرہ کے معمولات میں مشغول نظر آئے گا۔ وہ کھائے پیئے گا، بیوی بچوں کے ساتھ رہے گا، مگر اس کا ذہن ہر لحہ پھانسی کے ذکر (یاد) میں مشغول رہے گا۔ وہ کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہو پائے گا۔ بس اس مثال سے ذکر کی حقیقت سمجھ سکتے ہو۔

ذکر حقیقۃً ایک مستقل یاد کا نام ہے نہ کہ کوئی عددی نصاب پورا کرنے کا۔ جب آدمی اللہ کو پالیتا ہے تو وہ اس کی روح میں سما جاتا ہے، وہ اس کے خون میں تیرنے لگتا ہے۔ ہر موقع ہر اس کو خدا کا خیال آتا رہتا ہے۔ زندگی کا ہر واقعہ اس کو خدا کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ یہ یاد کبھی سینہ کی کسک بن کر اس کو تڑپا دیتی ہے۔ کبھی اس کے دل کو پگھلا کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ کبھی خوف یا محبت کے کلمہ کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتی ہے۔ کبھی شکر یا دعا بن کر اس کی زبان سے ٹپک پڑتی ہے۔

ذکر کسی قسم کے رٹے ہوئے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے، ذکر دل کی ایک حالت کا نام ہے۔ دل کے اندر اٹھنے والی یہ موجیں کبھی الفاظ کی صورت میں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں، یہ الفاظ ذکر و دعا کے معروف الفاظ بھی ہو سکتے ہیں اور غیر معروف الفاظ بھی، وہ عربی میں بھی ہو سکتے ہیں اور آدمی کی اپنی مادری زبان میں بھی۔ مگر ذکر یقینی طور پر کسی قسم کے تکرار الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ اس قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجہ میں خدا کو یاد کرنے والے الفاظ زبان سے نکل پڑتے ہیں۔ الفاظ کی تکرار کو ذکر کہنا ایسا ہی ہے جیسے ریکارڈ کی آواز کو ایک زندہ انسان کا کلام کہا جائے۔

ذکر کی کوئی حد مقرر نہیں

حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو چیز بھی فرض کی ہے اس کی کوئی معلوم حد ہے۔ پھر عذر کی حالت میں آدمی کیلئے رخصت ہے۔ مگر ذکر (یاد) کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اور نہ اس کے چھوڑنے کیلئے کوئی عذر قابل قبول ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرو۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴، تحت سورۃ الاحزاب) یہاں ہم ذکر کے بارہ میں دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:

اخرج الامام احد عن معاذ بن جبل مرفوعا قال: الا اخبر کم بخیر اعمالکم وازکاھا عند ملیککم و ارضھا فی درجاتکم و خیر لکم من تعاطی الذھب والفضة و من ان تلقوا عدوکم غداً فتضربوا أعناقھم و یضربوا أعناقکم قالوا بلی یا رسول اللہ، قال ﷺ: ذکر اللہ عزو جل، وردی أن رجلا سأل النبی ﷺ قال: أی المجاھدین أعظم أجراً یا رسول اللہ؟ قال ﷺ: أکثرھم اللہ تعالیٰ ذکراً، قال فأی الصائمین آکثر آجرً، قال ﷺ: اکثرھم اللہ عزو جل ذکراً، ثم ذکر الصلا و الزکاۃ ؤ الحج و الصدقة، کل ذلک یقول رسول اللہ ﷺ: اکثرھم اللہ ذکراً، فقال ابوبکر لمعر رضی اللہ عنھما: ذھب الذاکرون بکل خیر، فقال رسول اللہ ﷺ: أجل (أخرجه الامام أحد فی المسند)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل سے فرمایا: کیا میں تم کو بتاؤں کہ تمہارے اعمال میں سب سے اچھا عمل کیا ہے۔ اور تمہارے مالک کے یہاں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے اور تمہارے رتبہ کو سب سے زیادہ بڑھانے والا ہے اور تمہارے لئے سونا چاندی دینے سے بھی زیادہ بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ تم کل اپنے دشمن سے ملو، تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں۔ صحابہ نے کہا ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا: اللہ

تعالیٰ کا ذکر۔ اسی طرح روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، مجاہدوں میں سب سے زیادہ اجر کس مجاہد کا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہو۔ پھر آدمی نے پوچھا کہ روزہ داروں میں سب سے زیادہ اجر کس روزہ دار کا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے۔ اسی طرح آدمی نے نماز اور زکوٰۃ اور حج اور صدقہ کے بارہ میں سوال کیا۔ ہر بار آپ یہی جواب دیتے رہے کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ اللہ کا ذکر کرے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے کہا: ذکر کرنے والے نیکی میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں۔

ذکر تمام عبادتوں سے افضل کیوں ہے۔ اسلئے کہ ذکر تمام عبادتوں کا خلاصہ ہے۔ تمام عبادات واعمال سے بالآخر جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ آدمی خدا کا ذکر کرنے والا بن جائے۔

ذکر دراصل معرفت خداوندی کا دوسرا نام ہے۔ جب آدمی کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہوتی ہے جب اس کا تصور ظاہر کے پردہ کو پھاڑ کر غیب کی حقیقتوں کو دیکھ لیتا ہے تو اس وقت اس کے عین قدرتی نتیجہ کے طور پر، جو کیفیت آدمی پر گذرتی ہے اسی کا نام ذکر ہے۔ ذکر دراصل ایک اعلیٰ ترین تجربہ ہے نہ کہ کسی قسم کی لفظی تکرار۔

ذکر کا تعلق کسی لفظ سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہے۔ ذکر دراصل کسی انسان کا وہ قیمتی لمحہ ہے جب کہ وہ خدا کی عظمتوں کو اتنی گہرائی کے ساتھ پالے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی کا بھونچال آجائے اور اس کی زبان سے اس کے اعتراف واظہار کا فوارہ پھوٹ نکلے۔

ذکر کسی بندۂ خدا کی اس حالت کا نام ہے جب کہ وہ خدا کے احسانات اور اس کے کمالات کو سوچتا ہے۔ اس سے اس کے قلب ودماغ میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اس کی روح یاد خدا میں نہا اٹھتی ہے۔ اس کی زبان سے بے ساختہ خدا کی خدائی کے اعتراف میں ملکوتی الفاظ نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو موت اور آخرت کی یاد آتی ہے۔ وہ زندگی کے آغاز وانجام پر غور

کرتا ہے۔ یہ چیزیں اس کو تڑپا دیتی ہیں۔ وہ بیتابانہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جس میں جہنم کا خوف لپٹا ہوا ہو اور جس میں جنت کی خوشبو شامل ہو گئی ہو۔

جس آدمی کا رخ اللہ کی طرف ہو جائے تو اس پر ایسے خصوصی لمحات آتے ہیں جب کہ اس کے رب سے اس کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ جب بندگی اور خدائی ایک دوسرے سے بہت قریب آجاتے ہیں۔ جب بندہ اپنے رب کو دیکھنے لگتا ہے۔ ان خصوصی لمحات میں روح انسانی کے اندر جو تموج پیدا ہوتا ہے اور احساس بندگی اور اعتراف خداوندی کے دوطرفہ احساس کے تحت جو کلمات نکل پڑتے ہیں انہیں کو دین کی اصطلاح میں ذکر کہا جاتا ہے۔

ہم کسی ایسے سورج کو نہیں جانتے جس میں روشنی نہ ہو۔ ہم کسی ایسے کارخانہ سے واقف نہیں جس کا کوئی انجنیر نہ ہو۔ مگر دنیا کو دیکھئے تو یہاں بڑا عجیب منظر سامنے آتا ہے۔ یہاں آرٹ ہے مگر آرٹسٹ نہیں۔ یہاں کارکردگی ہے مگر کارپرداز نہیں۔ یہاں حکمت ہے مگر حکیم نہیں۔ یہاں سرگرمیاں ہیں مگر کوئی محرک نہیں۔ یہاں زندگی ہے مگر کوئی زندگی بخش نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہاں خدائی ہے مگر کوئی خدا نہیں۔

ذکر وہ ربانی لمحہ ہے جب کہ آدمی اس خلا کو عبور کر لیتا ہے۔ جب وہ ''نہیں'' سے گزر کر ''ہاں'' تک پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ وہ مخلوقات کے پردہ میں اس کے خالق کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین دریافت ہوتی ہے۔ اس دریافت کے وقت دریافت کرنے والے کے دل اور زبان پر جو تجربہ گزرتا ہے اسی کا دوسرا نام ذکر ہے۔

۱۶ جولائی ۱۹۶۹ کی رات تمام اخباروں کے دفتروں میں زبردست سرگرمیوں کی رات تھی۔ اسی روز پہلا انسان (آرم اسٹرانگ) چاند پر اترا تھا اور اخباروں کے دفتر میں ٹیلی پرنٹر پر مسلسل خبریں آرہی تھیں۔ جن کو اخبارات کا اسٹاف کل صبح کے اخبار کیلئے تیزی سے لے رہا تھا۔

اس روز رات کو میں ایک اخبار کے دفتر میں گیا۔ اخبار کے نیوز ایڈیٹر اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے تازہ واقعہ کے بارے میں

دریافت کیا تو ان کی زبان سے نکلا:

''بڑی تھرلنگ نیوز آرہی ہے''

میں نے سوچا کہ انسان زمین سے سفر کر کے آسمان تک پہنچ گیا تو اس خبر کو سن کر لوگوں کے اندر Thrill پیدا ہو رہا ہے۔ مگر زمین اور چاند کو دیکھ کر اور ان کے درمیان حیرت انگیز نظام کا مشاہدہ کر کے آدمی کے اندر تھرل پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی واقعات پر تھرل مگر خدائی واقعات پر کوئی تھرل نہیں۔

انسانی کرشمہ کو دیکھ کر اڈیٹر کی زبان سے جو جملہ نکلا' اسی قسم کے الفاظ جب خدائی کرشمہ کو دیکھ کر نکلنے لگیں تو اسی کا نام دین کی اصطلاح میں ذکر ہے۔

قبولیت دعا میں تاخیر

جاء فی الآثار ان العبد اذا دعا ربه وهو يحبه قال: يا جبريل لا تعجل بقضاء حاجة عبدی فانی احب ان اسمع صوته (ابن رجب حنبلی' جامعہ العلوم والحکم' مکتب الریاض' مکتبہ ریاض الحدیثہ' قاہرہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۴۲)

بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ اس کو محبوب ہوتا ہے تو وہ فرماتا ہے اے جبرئیل' میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر۔ مجھے محبوب ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں۔

سب سے افضل عمل

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن کا درجہ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن سب سے افضل ہوگا۔ فرمایا کہ اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والے (ان رسول اللہ ﷺ سئل ای العباد افضل درجة عند الله يوم القيامة قال الذاكرين الله كثيرا) الترمذی، کتاب الدعوات۔

ذکر کا مطلب کسی قسم کا لفظی ورد نہیں ہے۔ اس کا مطلب اللہ کی یاد ہے۔ اللہ کی یاد پورے دین کا خلاصہ ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو اس کی عظمت وجلال کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو یہ دریافت اس کی پوری شخصیت کے اندر ایک ہلچل پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے دل میں خدا کی یاد کا طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ اندرونی کیفیت بار بار تکبیر تحمید کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

اسی بے تابانہ یاد کا نام ذکر ہے۔ اس ذکر کا کوئی وقت نہیں، وہ ہر حال میں آدمی کی زبان پر جاری رہتا ہے، خواہ گھر کے اندر ہو یا مسجد میں ہو یا میدان جہاد میں۔ یہ ذکر بلاشبہہ تمام اعمال میں سب سے افضل عمل ہے۔ الترمذی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو وہاں خوب چرلو۔ پوچھا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں۔ فرمایا ذکر کے حلقے (اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا۔ قالوا وما رياض الجنة ۔ قال حلق الذكر)

الطبرانی نے یہ روایت کسی قدر لفظی فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اس میں ہے کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو خوب چرلو۔ پوچھا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہے۔ فرمایا کہ علم کی مجلسیں (اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا۔ قالوا وما رياض الجنة ۔ قال مجالس العلم) مجلس ذکر اور مجلس علم دونوں ایک ہیں۔ انفرادی ذکر جب اجتماعی ذکر کی صورت میں ہو تو اسی کا نام مجلس ذکر یا مجلس علم ہے۔

مینٹل اکٹیوٹی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے (ولذکر اللہ اکبر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک گھڑی کا سوچنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے (تفکر ساعة خیر مین عبادة سنة)

ذکر وفکر سے متعلق جو آیتیں اور حدیثیں ہیں، ان کا ایک مطلب خالص روحانی ہے۔ یعنی اللہ کی صفتوں کو یاد کرنا اور ان سے ان جذبات و کیفیات کا دل میں پیدا ہونا جن کو قرآن میں خشوع، تضرع، اخبات، انابت وغیرہ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کیفیت دین کا اصل مطلوب ہے اور یہی خود عبادت کا بھی خلاصہ ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے ایک اور بہت اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ علم کی فوقیت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی عمل (physical activity) کے مقابلہ میں ذہنی عمل (mental activity) کی اہمیت زیادہ ہے۔ جسم کی حرکت سے آدمی جو کام کرتا ہے، اس سے بہت زیادہ قیمت اس کام کی ہے جو وہ دماغ کی حرکت کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ ایک گھڑی کا دماغی کام ایک سال کے جسمانی کام کے برابر ہے۔

ایک مزدور بھی محنت کرتا ہے اور ایک انجنیر بھی۔ مگر مزدور کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ معاوضہ وہ ہے جو انجنیر کو ملتا ہے۔ اسی مثال سے جسم اور ذہن کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جسمانی محنت اگر ہتھوڑا چلاتی ہے تو دماغی محنت مشین چلاتی ہے۔ جسمانی محنت پاؤں سے سفر کرتی ہے تو دماغی محنت کار اور ہوائی جہاز کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ جسمانی محنت ظاہر کو جانتی ہے تو دماغی محنت حقیقت کا پتہ کر لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر تلوار سے لڑتی ہے تو دماغی محنت لڑائی کئے بغیر جنگ جیت لیتی ہے۔ جسمانی محنت اگر آدمی کو دکھائی دینے والی دنیا تک پہنچاتی ہے تو دماغی محنت کے ذریعہ آدمی غیب تک اور خدا کی چھپی ہوئی دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔

اصل وسیلہ

قرآن میں ہے کہ زمین و آسمان میں خدا کی جو تخلیقی نشانیاں ہیں ان کو دیکھنا اہل ایمان کے لئے خدا کی یاد (ذکر) کا وسیلہ ہیں (آل عمران)۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فضا میں ایک چڑیا اڑتی ہوئے دیکھتے تو اس سے بھی لوگوں کو خدا کی یاد دلاتے۔ دوسری طرف قرآن میں ہے کہ حضرت یونسؑ جب مچھلی کے پیٹ میں تھے، جب وہ زمین و آسمان کی آیات (نشانیوں) کو براہ راست طور پر دیکھ نہیں سکتے تھے، انہوں نے اس وقت اللہ کی تسبیح کی اور اس کا ذکر کیا (الصفّٰت ۱۴۳)

یاد ہمیشہ کسی واسطہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مثلاً کبھی قطب مینار کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کی یاد آتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ''قطب مینار'' کا لفظ اپنے ذہن میں دہراتا ہے اور اس سے قطب مینار کے صانع کی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ خدائی یاد (ذکر اللہ) کا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات میں پھیلی ہوئی باکمال کاریگری کو دیکھتا ہے۔ یہ باکمال کاریگری اس کو خالق کی یاد دلاتی ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔

کبھی انسان پر وہ لمحہ آتا ہے جب کہ کائنات کی محسوس نشانیاں اسے دکھائی نہیں دیتیں۔ مثلاً وہ جیل کے کمرہ میں بند کر دیا جائے یا وہ آنکھوں سے معذور ہو گیا ہو۔ اس دوسری حالت میں وہ الفاظ کے واسطہ سے اپنا ربط خدا سے قائم کرتا ہے۔ وہ خدا کا نام لے کر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔

آدمی خلا کی حالت میں کسی چیز کا تصور قائم نہیں کر سکتا۔ قطب مینار کو یاد کرنے کے لئے یا تو اس کو دیکھنا ہوگا، یا ''قطب مینار'' کا لفظ اپنے ذہن میں لانا ہوگا مجرد انداز میں کسی کو یاد کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں۔

خدا کے ذکر (یاد) کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کی تخلیقات کو دیکھ کر اس کا تصور ذہن میں لایا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ذکر کے الفاظ کو زبان سے ادا کر کے خدا سے یاد والا تعلق قائم کیا جائے۔ دونوں ہی ذکر کی صورتیں ہیں۔ افضل ذکر کا تعلق اندرونی کیفیت سے ہے نہ کہ ذکر کی ظاہری صورت سے۔

خدا کی کائنات میں غور وفکر سب سے بڑی عبادت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ ایک گھڑی کا سوچنا ستر برس کی عبادت سے افضل ہے۔ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص تنہائی میں اللہ کو یاد کرے' وہ ایسا ہے جیسا اکیلا کفار کے مقابلہ میں چل دیا ہو۔ایک حدیث کے مطابق سات آدمی وہ ہیں جن کو اللہ اس دن اپنے سایہ کے نیچے جگہ دے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ان میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھ سے آنسو بہہ پڑیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ عقل والے لوگ کہاں ہیں۔لوگ پوچھیں گے' عقل والے کون ہیں۔جواب دیا جائے گا' وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے' بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہے اور آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے تھے اور کہہ اٹھتے تھے' خدایا تو نے ان کو عبث پیدا نہیں کیا۔تو پاک ہے۔پس ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ابن ابی الدنیا نے ایک مرسل روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار صحابہ کی جماعت کے پاس آئے۔وہ لوگ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔آپ نے فرمایا' کیا سوچ رہے ہو۔انہوں نے جواب دیا' اللہ کی مخلوقات میں غور کر رہے ہیں۔آپ نے فرمایا۔ہاں اللہ کی ذات میں غور نہ کرو' اللہ کی مخلوقات میں غور کیا کرو۔

ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص چھت پر لیٹا ہوا آسمان اور ستاروں کو دیکھ رہا تھا۔اس پر خدا کی عظمت کا تاثر قائم ہوا اور بولا: ''خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ تمہارا پیدا کرنے والا کوئی ضرور ہے' اے اللہ تو مجھے بخش دے''۔خدا کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور وہ بخش دیا گیا۔عبداللہ بن عباس کہتے ہیں' ایک ساعت کا غور تمام رات

کی عبادت سے افضل ہے۔ام درداء سے پوچھا گیا کہ ابودرداء کی محبوب عبادت کیا تھی' فرمایا غور وفکر۔ابو ہریرہ کی ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک ساعت کا غور و فکر ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے۔حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی وہ مخفی یاد جس کو فرشتے بھی نہ سن سکیں' اس کا ثواب ستر درجہ زیادہ ہے۔

عبادہ بن صامت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ بہترین ذکر خاموش ذکر ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کا درجہ رکھتا ہو۔ایک حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا کہ اللہ کو ذکر خامل سے یاد کیا کرو' پوچھا گیا' ذکر خامل کیا ہے۔فرمایا ''مخفی یاد''۔

یہی وہ ذکر (یاد الٰہی) ہے جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ جو ایسا کرے اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں خواہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

عن ابی هريرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم الدنيا ملعونة و ملعون مافيها الاذكر الله و مادلاه و عالماو متعلما

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی۔مگر اللہ کی یاد اور وہ چیزیں جو اس کے قریب ہو اور عالم اور طالب علم۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ غور وفکر کو افضل عبادت اس لئے کہا گیا کہ اس میں ذکر (یاد الٰہی) تو موجود ہوتا ہی ہے' اسی کے ساتھ اس میں دو چیزوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک اللہ کی معرفت' کیونکہ غور وفکر معرفت کی کنجی ہے' دوسرے' اللہ کی محبت کہ وہ فکر سے پیدا ہوتی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں' اگر علم چاہتے ہو تو قرآن کے معانی پر غور کرو کہ اس میں اولین و آخرین کا علم ہے۔

خدا سے غافل

کسی شخص سے اس کے عزیز بیٹے کا ذکر کیجئے تو اس کے پاس اپنے بیٹے کے بارہ میں کہنے کے لئے اتنی زیادہ باتیں ہوں گی کہ کبھی ختم نہ ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا تذکرہ کیجئے تو وہ اس طرح غیر متحرک بنا رہے گا جیسے کہ اس کے پاس خدا کے بارہ میں کہنے کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ خدا کے بارہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

کسی شخص کو اس کے خاندانی بزرگ کی یاد دلا دیجئے تو وہ اس قدر پر جوش طور پر بولنے لگے گا جیسے کہ اس کے تمام اندرونی احساسات جاگ اٹھے ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا ذکر کیجئے تو وہ جذبات سے اس طرح خالی نظر آئے گا جیسے کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ خدا کے بارہ میں کیا کہا جائے۔

کسی شخص کے سامنے اس کے جماعتی اکابر کا نام لیجئے۔ اچانک الفاظ کا دریا اس کی زبان سے بہہ پڑے گا۔ وہ اس وقت تک چپ نہ ہوگا جب تک آپ مداخلت کر کے موضوع بدل نہ دیں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا نام لیجئے تو اس کے اندر کوئی جوش پیدا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے اس کے پاس خدا کے بارہ میں بولنے کیلئے کوئی چیز ہی نہیں۔

ایک شخص کے سامنے اس کے قومی ہیرو کا چرچا کر دیجئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ اچانک وہ بادشاہ سخن بن کر ظاہر ہو گیا ہے۔ مگر اسی کے سامنے خدا کا چرچا کیجئے تو وہ ایسا نظر آئے گا جیسے کہ اس کے اندر خدا کا نام سن کر کوئی ہلچل ہی پیدا نہیں ہوئی جو اس کو بولنے پر مجبور کر دے۔

آہ وہ لوگ جن کے پاس رجال کی تعریف کے لئے الفاظ ہوں مگر خدا کی تعریف کے لئے ان کے پاس الفاظ نہ ہوں۔ انسانوں کے بارہ میں وہ معلومات کا خزانہ بنے ہوئے ہوں مگر خدا کے بارہ میں ان کے پاس کوئی معلومات نہیں جو ان کے زبان یا قلم سے جاری ہو۔ کیا سینوں میں ایمان کے سوتے خشک ہو گئے۔

کیا لوگوں نے خدا کی عظمت کو محسوس نہیں کیا جس کو وہ لوگوں سے بیان کریں۔ کیا لوگوں کو خدا کے کمالات کا کوئی مشاہدہ نہیں ہوا۔ کیا انہیں صرف مخلوقات کی خبر ہے' خداوند ذوالجلال کی انہیں کوئی خبر نہیں۔

مجبورانہ خدا پرستی

اخبار ہندوستان ٹائمس کے ایڈیٹر نے ایک فیلڈ اسٹڈی (۱۵ مئی ۱۹۸۲) کے ذریعہ ہندوستانی لوگوں کا مزاج معلوم کیا۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستانیوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خدا ان کے یہاں سب سے اوپر ہوتا ہے۔ جب ہر چیز ٹھیک ہو تو پیسہ سب سے اوپر آجاتا ہے اور خدا کو دوسرے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔

When a catastrophe stirkes, God is tops. When all is tranquil, money manages to push God down to the second place.

یہ بات نہ صرف ہندوستانیوں کے لئے صحیح ہے بلکہ وہ عام انسانوں کے لئے بھی بڑی حد تک درست ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ تکلیف اور بے بسی کے لمحات میں وہ سب سے زیادہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور کوئی پریشانی سامنے نہ ہو تو وہ اپنے مادی مفادات کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔

مگر اس قسم کی خدا پرستی خدا پرستی نہیں۔ وہ صرف آدمی کے اس جرم کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے رب کو بھولا ہوا تھا۔ وہ وقت جب کہ اسے خدا کو یاد کرنا چاہئے تھا اس وقت اس نے خدا کو یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کی حقیقت اس پر کھول دی۔ اس کی آنکھ سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔ جب ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر خدا کو پکارنے لگا۔

انسان ایک آزاد اور بااختیار مخلوق ہے۔ اس سے آزادانہ خدا پرستی مطلوب ہے نہ کہ مجبورانہ۔ انسان کا یاد کرنا وہ یاد کرنا ہے جب کہ اس نے راحت کے لمحات میں خدا کو یاد کیا ہو۔ راحت کے وقت خدا کو بھلائے رکھنا اور جب مصیبت آئے تو خدا کی طرف دوڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

پھر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دولت کو سب سے بڑا درجہ دئے ہوئے ہیں وہ جھوٹے معبود کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ جو چیز مصیبت کے وقت آدمی کا سہارا نہ بنے، جس کو آدمی خود نازک لمحات میں بھول جائے وہ کسی کا معبود کس طرح ہو سکتی ہے۔

معیاری زندگی

انسان کی کامیابی کیا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی قربت نصیب ہو۔ دنیا میں یہ قربت ''ذکر'' کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں یہ قربت ''جنت'' کی صورت میں خدا کے ذاکر بندوں کو ملے گی۔

ذکر دراصل خدا سے حسیّاتی قربت کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کے شعور اور احساس پر جب خدا کا تصور غالب آتا ہے تو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے دل پر خدا کا خیال چھایا رہتا ہے۔ ہر تجربہ اور مشاہدہ میں اس کو خدا کا جمال و کمال دکھائی دیتا ہے۔ اسی یاد خداوندی کا نام ذکر ہے۔

جب آدمی پر یاد کی یہ کیفیت غالب آتی ہے تو اس وقت اس کی زبان سے تسبیح و تحمید کے کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ یہ کلمات رٹے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے۔ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار کو ''ذکر'' کہنا ذکر کی تصغیر ہے۔ ذکر اس سے زیادہ لطیف حقیقت ہے کہ وہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار میں سما سکے۔ ذکر دراصل اپنے آپ کو اللہ میں گم کر دینے کی ایک حالت ہے' یہ بندہ اور خدا کا وہ آخری ملاپ ہے جو موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے۔

جنت خدا کی نعمتوں کا ابدی باغ ہے۔ یہاں خدا کی نعمتیں اپنی آخری اور معیاری صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یہ جنت انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کو اللہ کے سچے ذکر کی توفیق حاصل ہوئی۔

ذکر خدا کی معرفت میں جینے کا نام ہے۔ اور خدا کی معرفت میں جینے سے زیادہ عظیم کوئی زندگی موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ یہ ذکر کسی آدمی کو کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ قرآن میں غور و فکر بتایا گیا ہے۔ جب ایک انسان کے اندر ربانی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو خدائی زاویہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی پوری کائنات میں خدا کے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر چیز اس کے لئے خدا کا تعارف بن جاتی ہے۔ ان لطیف تجربات کے دوران اس کی زبان سے جو کلمات حمد نکلتے ہیں انہیں کا نام قرآنی اصطلاح میں ذکر ہے۔

لطیف تجربات

الاصمعی عبدالملک بن قریب کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں دیکھا کہ دو قبریں ہیں' ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ غم کی وجہ سے اس کا برا حال ہو رہا ہے۔ میں قریب ہوا تو میں نے سنا کہ وہ ان الفاظ میں دعا کر رہی ہے:

اللھم انک کائن قبل کل شیء وانک کائن بعد کل شیء و انک خالق کل شیء و انک رب قد خلقت ابوی من قبلی ثم خلقتنی بعد ھما متھما وانک آنستنی بھما ماشئت ثم او حشتنی منھما اذشئت ۔اللھم فکن لھما راحماو کن لی بعد ھما حافظا

ترجمہ: اے اللہ تو ہی سب سے پہلے ہے اور تو ہی سب سے بعد ہے۔ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے' اے میرے رب تو ہی نے میرے ماں باپ کو مجھ سے پہلے پیدا کیا' اس کے بعد ان دونوں سے مجھ کو پیدا کیا۔ تو نے ان کے ساتھ مجھے سکون دیا جب تک تو نے چاہا اور پھر جب چاہا تو نے ان کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اے اللہ' تو ان دونوں پر رحم فرما اور ان کے بعد میری حفاظت فرما۔

اصمعی کا بیان ہے کہ اس لڑکی کے حسن کلام نے میری عقل کو مبہوت کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے بیٹی اپنے کلام کو پھر ایک بار دہرا۔ یہ سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولی: اے شیخ' خدا کی قسم میں تمہاری بیوی نہیں کہ تم مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو۔ تم کو اپنے گھر والوں سے بے تکلف ہونا چاہئے۔ اصمعی کہتے ہیں: خدا کی قسم میں یہ سن کر شرما گیا اور وہاں سے بھاگ آیا (ففررت واللہ عنھا حیاء منھا)

ایک معمولی لڑکی کیلئے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اتنے گہرے انداز میں دعا کرے۔ اسکی وجہ وہ حادثہ تھا جو اس پر گزرا۔ آدمی جب کسی جھٹکے سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں پالیتا ہے جو اس نے اس سے پہلے نہیں پائی تھیں۔ وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اس سے پہلے کبھی اس کی زبان پر نہیں آئے تھے۔ آدمی طبعی طور پر آسودگی کے حالات کو پسند کرتا ہے۔ مگر آسودگی کسی آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ ان ربانی تجربات سے محروم رہ جائے جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے تھے۔

تسبیح خواتین

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو خاص طور پر ایک تسبیح بتائی۔ یہ عام طور پر تسبیح فاطمہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ۳۳ بار کہو: سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ پھر ۳۳ بار کہو الحمد للہ، الحمد للہ۔ پھر ۳۴ بار کہو: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہ سب ملا کر ایک سو بار ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں تمہارے لئے بہت زیادہ ثواب ہے۔

اس تسبیح کو تسبیح فاطمہ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ ہی کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے حضرت فاطمہؓ کے واسطہ سے امت کی تمام خواتین کو ذکر کا یہ قیمتی تحفہ عطا فرمایا ہے۔ بظاہر وہ تسبیح فاطمہؓ ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ تسبیح خواتین ہے۔

اصل یہ ہے کہ فطری طور پر عورتوں کا ایک خاص مزاج ہے۔ اس مزاج کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو وہ فوراً ایک دوسرے کی باتوں کا غیر ضروری چرچا کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ کسی نہ کسی کے بارہ میں جا و بے جا باتیں ان کا موضوع گفتگو بن جاتی ہیں۔ یہ عورتوں کی ایک عام کمزوری ہے جس سے بہت کم عورتیں اپنے کو محفوظ کر پاتی ہیں۔

مذکورہ تسبیح عورتوں کو اس گناہ سے بچانے کی ایک تدبیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح خواتین کو ایک اچھی مشغولیت دے دی ہے جس میں اپنے آپ کو مصروف کر کے وہ ثواب بھی حاصل کریں اور آخرت کے نقصان سے بھی بچ جائیں۔

خاص طور پر زیادہ عمر کی عورتوں کے لئے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ ایک عورت کی عمر جب بڑھتی ہے تو اس کے بعد اس کی عملی مصروفیت اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے اپنے خالی وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے بے جا تذکرہ میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ تسبیح کی صورت میں خدا کا ذکر کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کو قلبی سکون حاصل ہوگا اور آخرت میں جنت کا ابدی آرام۔

ذکر و فکر

قال الشیخ ابو سلیمان الدرانی: انی لاخرج من منزلی فمایقع بصری علیٰ شئیء الا رأیت اللہ علی فیہ نعمۃ ولی فیہ عبرۃ

شیخ ابوسلیمان درانی نے کہا کہ میں اپنے گھر سے نکلتا ہوں تو میرا حال یہ ہوتا ہے کہ جس چیز پر بھی میری نظر پڑتی ہے اس میں مجھے اللہ کی نعمت دکھائی دیتی ہے اور اس میں میرے لئے عبرت ہوتی ہے۔

عن الحسن البصری انہ قال: تفکر ساعۃ خیر من قیام لیلۃ

حسن بصری نے کہا کہ ایک گھڑی کیلئے اللہ میں سوچنا ساری رات نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

قال سفیان بن عُیینہ: الفکرۃ نور یدخل قلبک ویقول:

اذا المرء کانت لہ فکرۃ ' ففی کل شئیء لہ عبرۃ

سفیان بن عیینہ نے کہا کہ غور و فکر کرنا روشنی ہے جو تمہارے دل میں داخل ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب آدمی کے اندر سوچ کا مادہ ہو تو ہر چیز میں اس کے لئے عبرت و نصیحت ہوگی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ آدمی مبارک ہے جس کا بولنا یاد الٰہی کا بولنا ہو۔ جس کی خاموشی غور و فکر کی خاموشی ہو اور جس کا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔

(عن عیسٰی علیہ السلام انہ قال: طوبیٰ لمن کان قیلہ تذکراً وصمتہ تفکراً ونظرہ عبراً)

دین کی اصل حقیقت ذکر و فکر ہے۔ ذکر و فکر سے مراد معروف قسم کے اوراد و اشغال نہیں۔ ذکر و فکر ایک زندہ عمل ہے جو شعور خداوندی کی زمین پر پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک شخص پر اللہ کی حقیقت اپنے جلال و کمال کے ساتھ منکشف ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں ایک نئی روشنی آجاتی ہے۔ اس کی روح ربانی جلوؤں سے بیدار ہو جاتی ہے۔

ایسا آدمی اندر سے باہر تک بدل جاتا ہے۔ اس کا چپ رہنا اور اس کا بولنا' اس کا دیکھنا اور اس کا سننا' اس کا چلنا اور اس کا رکنا' ہر چیز میں ایک ربانی نور پیدا ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا اس کے لئے رزق رب کا دستر خوان بن جاتی ہے۔ یہی وہ ربانی انسان ہے جس کو مومن باللہ کہا جاتا ہے۔

ربّانی احساسات

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔ اللہ کے ذکر کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ یہ یاد کوئی مصنوعی چیز نہیں وہ اللہ کی معرفت کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے۔

جب کوئی آدمی اللہ کو اس کی عظمتوں اور قدرتوں کے ساتھ پاتا ہے تو اس کے اندر ایک روحانی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ اس کو ہر وقت اللہ کی یاد آتی رہتی ہے۔ یہ یاد کبھی دل کے اندر تڑپ بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی زبان سے حمد اور شکر اور خشیت کے الفاظ کی صورت میں بے ساختہ نکل پڑتی ہے۔ اسی کیفیت کو اللہ کی یاد کہا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اتھاہ خلا میں ستاروں اور کہکشاؤں کی حرکت پر غور کرتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ وہ خدا بھی کیسا عظیم خدا ہوگا جو اتنے بڑے کارخانے کو اتنی صحت کے ساتھ متحرک کئے ہوئے ہے۔ کبھی وہ درختوں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے پرکشش مناظر کو دیکھتا ہے اور ان کے حسن اور معنویت کا ادراک کر کے حیران رہ جاتا ہے۔ آدمی کو اس کے گرد و پیش کی چیزیں بار بار اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اس کے اندر اللہ کی یاد کو جگاتی رہتی ہیں۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بے تابانہ اپنے رب سے معافی مانگنے لگتا ہے۔ وہ خدا سے کہتا ہے کہ وہ اس کو آخرت کے عذاب سے بچائے۔ اور اس دن اپنی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرے جب کہ خدا کی رحمت کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا جہاں آدمی پناہ لے سکے۔ کبھی آدمی اپنے عجز اور بے چارگی کو دریافت کرتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ خدایا تو قادر مطلق ہے تو اپنی قدرت سے میرے عجز کی تلافی فرما۔

انسان کے دل میں انہیں ربانی احساسات کا پیدا ہونا اور ان احساسات کا الفاظ کی صورت میں ڈھل جانا، اسی کا نام ذکر ہے۔ ذکر اللہ کی یاد ہے، سب سے بڑی حقیقت کی یاد۔ جو چیز سب سے بڑی حقیقت کی یاد ہو اس کا تجربہ بھی سب سے بڑا تجربہ ہوتا ہے۔ اس تجربہ کا کسی کے دل پر گزرنا اتنا بڑا واقعہ ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

معنی نہ کہ الفاظ

عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسلم انه قال: من جسل فی مجلس فکثر فیه لغطه فقال قبل ان یقوم من مجلسه: سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لا اله الا انت استغفرک و اتوب الیک ' الا عفر الله له ما کان فی مجلسه ذالک (ترمذی' نسائی)

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو آدمی کسی مجلس میں بیٹھا۔ وہاں زور زور سے باتیں ہوئیں پھر اس مجلس سے اُٹھنے سے پہلے اس نے کہا' اے اللہ تو پاک ہے اور تیری حمد ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں' میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ تو اس مجلس میں جو باتیں ہوئیں' اللہ ان کے لئے اسے معاف کر دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان ''الفاظ'' کو زبان سے کہہ دینے کی وجہ سے اللہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ یہ معافی دراصل ادائیگی معنی کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ محض ادائیگی الفاظ کی بنا پر۔

یہ اس شخص کا حال بیان ہوا ہے جسکے دل میں اللہ کا ڈر موجود ہو۔ ایسا شخص جب کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور وہاں کسی موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو گفتگو کے درمیان کبھی اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ زور زور سے بولتا ہے' وہ لوگوں سے غیر ضروری تکرار کرنے لگتا ہے۔

تاہم ابھی مجلس ختم نہیں ہوتی کہ اس کو احساس ہو جاتا ہے کہ میں نے غلط کیا۔ میں نے بے فائدہ کلام کیا۔ اس وقت اس کے دل میں شرمندگی کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے اندر ہی اندر اپنا احتساب کرنے لگتا ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں سے مخاطب تھا۔ اب وہ اپنے رب سے مخاطب ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکل پڑتے ہیں جس کا ایک نمونہ اوپر کی حدیث میں نظر آتا ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ حقیقۃً دعا کے معنی کو بتا رہے ہیں نہ کہ محض دعا کے الفاظ کو۔

کلام کی دو قسمیں

عن عبد الله بن عمر، قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا تكثروا الكلام بغير ذكر الله. فان كثرة الكلام بغير ذكر الله قسوة للقلب. وان ابعد الناس من الله القلب القاسى. (رواه الترمذى)

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام نہ کرو۔ کیوں کہ اللہ کے ذکر کے بغیر زیادہ کلام کرنا دل کی قساوت کی وجہ سے ہوتا ہے اور جس دل میں قساوت ہو وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے دور ہوتا ہے۔

اس حدیث میں ''ذکر'' سے مراد معروف معنوں میں کلماتِ ذکر نہیں ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بات کرتے ہوئے بار بار ذکر کے کلمات کو اپنی زبان سے دہراتے رہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات کو یادِ خداوندی کی کیفیت سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس کو یادِ خداوندی کی روح سے بھرا ہوا ہونا چاہئے۔

قساوت کے معنی سختی کے ہیں۔ ارض قاسیہ اس زمین کو کہتے ہیں جو بنجر ہو اور جس میں کچھ نہ اُگے۔ جب یہ لفظ دل کے لئے بولا جائے تو اس کا مطلب ہوگا سخت دل، ایسا دل جو بے حس ہو گیا ہو۔ جن لوگوں کے دلوں میں سختی آجائے، جن کے اندر حساسیت باقی نہ رہے، ان کا کلام ایک قسم کی لسانی ورزش ہوتا ہے۔ ایسے کلام میں تواضع اور خشیت کی روح باقی نہیں رہتی۔ وہ بے حس مشین کی طرح بولتے ہیں نہ کہ اس انسان کی طرح جو خدا کی عظمت وجلال میں غرق ہو کر بول رہا ہو۔

اس کے برعکس جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو، جس کو آخرت کی جواب دہی کے احساس نے گھلا رکھا ہو، وہ جب بولے گا تو اس کے لفظ لفظ میں اس کی قلبی کیفیت کا رنگ جھلک رہا ہوگا۔ اس کا کلام ایک سنجیدہ انسان کا کلام ہوگا۔ اس کے لہجہ میں دردمندی ہوگی۔ اس کی باتوں میں گہرائی ہوگی۔ اس کی ہر بات میں خدا اور آخرت کی فکر شامل ہوگی۔

بے حس آدمی کے الفاظ انسانی ڈکشنری سے ماخوذ ہوتے ہیں، حساس آدمی کے الفاظ خدائی معرفت سے۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کلام میں وہی فرق پیدا ہو جاتا ہے جو فرق زمین اور آسمان کے درمیان ہے۔

ربّانی کیفیت

عن قیس بن ابی حازم قال کان عبد اللہ بن رواحۃ واضعاً راسہ فی حجر امراتہ فبکیٰ فبکت امرأتہ. قال مایبکیک قالت رأیتک تبکی فبکیت قال انی ذکرت قول اللہ عزوجل (وانمنکم الاواردھا) فلاادری انجومنھا ام لا. وفی روایۃ وکان مریضاً (تفسیر ابن کثیر' الجزء الثالث' صفحہ ۱۳۲)

قیس بن ابی حازم تابعی حضرت عبداللہ بن رواحہ صحابی کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ وہ اپنا سر اپنی بیوی کے گود میں رکھے ہوئے تھے کہ وہ رو پڑے۔ ان کی بیوی بھی رونے لگیں۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم کو کس چیز نے رلایا۔ بیوی نے کہا کہ میں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو میں بھی رونے لگی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد آیا کہ تم میں سے ہر شخص جہنم سے گزرے گا (مریم) تو مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سے بچ جاؤں گا یا نہیں بچوں گا۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ بیمار تھے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں۔ ایک جلیل القدر صحابی کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وہ چیز کیا ہے جس کو شریعت میں ''ذکر'' کہا جاتا ہے۔ ذکر الفاظ کے ورد کا نام نہیں۔ وہ ایک معنوی طوفان کا نام ہے جو ایک بندے کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے رب کو یاد کرے۔

ایک شخص جو واقعۃً اللہ پر یقین رکھتا ہو وہ جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کی عظمت سے دہل اٹھتا ہے۔ وہ اس کے سامنے پیشی کے تصور سے کانپنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے اندر کی کیفیت بے اختیارانہ طور پر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی ذکر ہے۔ خدا کا ذکر خدا کو اپنے سینہ میں اتارنے کا نام ہے' ایسے خدا کو جس کی برداشت پہاڑ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طوفان خیز لمحہ میں جو ربانی کلمات انسان کی زبان سے نکلتے ہیں انہیں کا نام ذکر ہے۔ ذکر خدا کو پانے کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کے الفاظ کو پانے کا۔

اسمِ اعظم کیا ہے

ایک بزرگ سے ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ اسم اعظم کیا ہے۔ بزرگ نے فرمایا: جب آدمی کا پیٹ غذا سے خالی ہو اور اس کا دل کینہ سے خالی ہو تو وہ اللہ کے ناموں میں سے جس نام سے بھی اپنے رب کو پکارے گا وہی اسم اعظم ہوگا (تذکرۃ الاولیاء) گویا اسم اعظم کا تعلق ''اسم'' سے نہیں بلکہ کیفیت سے ہے۔ اسم اعظم وہ ہے جو اعلیٰ کیفیات کے ساتھ زبان سے نکلے۔ کیفیات کی عظمت کسی اسم کو اسمِ اعظم بناتی ہے نہ کہ حروف تہجی کی عظمت۔ پیٹ خالی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی مادیات کے غلبہ سے آزاد ہے اور دل میں کینہ نہ ہونا بتاتا ہے کہ آدمی اپنے سینہ میں کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی لئے ہوئے نہیں ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے کو مادی رونقوں سے اور انسانی شکایتوں سے اوپر اٹھالیتا ہے تو وہ خدا کے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اس کو خدا کے خصوصی فیضان میں سے حصہ ملنے لگتا ہے۔ ایسے وقت میں خدا کے صفاتی ناموں میں سے کوئی نام جب اس کی زبان پر آتا ہے تو وہ ربانی کیفیت میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔ ان کیفیات کے ساتھ جو بہتر نام آدمی کی زبان سے نکلے وہی اس کے لئے اسمِ اعظم ہے۔

کچھ لوگ اسلام کے معاملہ کو پاک کلمات کا ایک پراسرار معاملہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے کچھ خاص عربی الفاظ ہیں جن میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان پاک الفاظ کو یاد کر لے اور زبان سے ان کو ادا کرے تو ان کی صرف ادائیگی سے کراماتی نتائج ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ دنیا میں آل واولاد میں برکت ہوگی اور آخرت میں جنتی محل بننے لگیں گے۔ ان کے نزدیک ان بابرکت کلمات

میں سب سے زیادہ اونچا ''اسم اعظم'' ہے مگر یہ محض بے بنیاد خیال ہے جس کا کوئی ثبوت کتاب وسنت میں موجود نہیں۔ اسم اعظم حقیقۃً حروف کے کسی مجموعہ کا نام نہیں بلکہ کیفیات کے مجموعہ کا نام ہے۔ اللہ کو جب کوئی بندہ اس طرح یاد کرتا ہے کہ وہ ہر دوسری چیز سے اپنا رخ موڑ کر صرف اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ انسانوں کے لئے اس کے دل میں خیر خواہی کے سوا کوئی اور جذبہ باقی نہیں رہتا تو اس وقت اس کی زبان سے اللہ کے لئے جو کلمات نکلتے ہیں، اسی کا نام اسم اعظم ہے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے ''کہو کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو گے تو اس کے سب نام اچھے ہیں'' (بنی اسرائیل) اللہ خالق بھی ہے اور مالک بھی وہ رحیم بھی ہے اور اکبر بھی۔ وہ سب کچھ ہے۔ جس برتر نام سے بھی آدمی اس کو پکارے وہ اس کے لئے جائز ہوگا۔ البتہ پکارنے والے کی زبان سے نکلنے والا ایک لفظ کبھی اس کے لئے ''اسم اعظم'' بن جاتا ہے۔ یہ پکارنے والے کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اللہ کو اس کی صفتوں میں سے کسی صفت سے پکارنا کبھی سادہ اور عام حالت میں ہوتا ہے اور کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ خدا کا نام لیتے ہوئے آدمی کی شخصیت پھٹ پڑتی ہے۔ خدا کا نام لینا اس کی روح میں برپا ہونے والے طوفان کی آواز ہوتا ہے۔ اس طرح دل کے بھونچال کے ساتھ خدا کا نام لینا عام حالت میں اس کا نام لینے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے اسم کو اسم اعظم بنا دیتا ہے۔ بندہ جب اللہ کی عظمتوں کے احساس سے سرشار ہو اور اس کی سرشاری زبان پر لفظ کی صورت میں ڈھل جائے تو یہی اللہ کو اسم اعظم کے ساتھ یاد کرنا ہے۔

نفسیاتِ دعا

امریکہ کے سفر میں ایک مسلمان بھائی مجھے اپنے شاندار مکان میں لے گئے۔ اسکے بعد انہوں نے میز پر پرتکلف کھانا رکھا جس کو میں حسب عادت کھا نہ سکا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ آپ مجھے کوئی بہت اچھی سی دعا بتایئے جو میرے اور میرے بچوں کیلئے دین اور دنیا کی فلاح کی ضامن بن جائے۔ میں کچھ دیر تک خاموش ہو کر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ دعا عربی الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ دعا حقیقۃً ان روحانی کلمات کا نام ہے جو دعا والی نفسیات کے ساتھ آدمی کے اندر سے نکلے ہوں۔ جو لوگ دعا کی اعلیٰ نفسیات سے خالی ہوں وہ یقیناً اعلیٰ دعا کی نعمت سے بھی محروم رہیں گے۔

میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا حال یہ ہے کہ آپ لوگ دنیوی اسٹیٹس (status) کو اپنا سب سے بڑا کنسرن بنائے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی اصل انکم سے زیادہ بڑی حیثیت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے آپ میں سے ہر شخص سودی قرضوں میں نہایا ہوا ہے۔ آپ چھوٹے مکان کو چھوڑ کر بڑا مکان لیتے ہیں۔ آپ سکینڈ ہینڈ کار کے بجائے نئی شاندار کار خریدتے ہیں۔ آپ سادہ فرنیچر کے بجائے زرق برق فرنیچر سے اپنا گھر سجاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ سودی قرض پر ہوتا ہے جس کی قسطیں آپ زندگی بھر ادا کرتے رہتے ہیں۔

اس قسم کی مصنوعی زندگی نے آپ لوگوں کو دعا والی نفسیات سے محروم کر دیا ہے۔ دعا کی نفسیات جن تجربات کے دوران بنتی ہے، وہ ہیں ..... عجز، پستی، دل شکستگی، کم مائگی، احساس محرومی، عدم یافت۔ مگر آپ اپنے کو ان چیزوں سے دور رکھتے ہیں۔ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ مسائل حیات کے دوران آپ کو ان قیمتی تجربات سے گزارے۔ مگر آپ کی مسلسل یہ کوشش ہوتی ہے کہ سودی قرضوں کی مصنوعی تدبیر سے اپنے کو اور اپنے بیوی بچوں کو تجرباتِ حیات کے اس کورس سے گزرنے نہ دیں۔

آپ کو جاننا چاہئے کہ ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اسی طرح یقیناً دعا کی بھی ایک قیمت ہے۔ اچھی دعا اچھے الفاظ کا نام نہیں ہے۔ اچھی دعا اچھی نفسیات کا نام ہے۔ جس طرح اچھے گھر کی ایک قیمت ہوتی ہے، اسی طرح اچھی دعا کی بھی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں قیمت ادا کئے بغیر کوئی چیز نہیں ملتی، نہ ایک اچھا مکان اور نہ ایک اچھی دعا۔

لوگ دعا کا نتیجہ چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انہوں نے دعا کی قیمت ادا کی ہو، بغیر اس کے کہ انہوں نے خدا کے سامنے حقیقی دعا کا تحفہ پیش کیا ہو۔

دعاءاورعربی زبان

دعا کا تصور عام لوگوں کے ذہن میں تقریباً وہی ہے جو عاملین کے یہاں پر اسرار کلمات کا ہوتا ہے۔ عامل یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں الفاظ کسی خاص ترتیب یا خاص تعداد میں زبان سے ادا کردئے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں صورت میں برآمد ہوگا۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ دعا الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام ہے جس میں خاص تاثیرات چھپی ہوئی ہیں۔ اگر آدمی دعا کے ساتھ ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کردے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام تاثیرات لازماً ظاہر ہونا شروع ہوجائیں گی۔

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے لفظی مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جو احساس احتیاج کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے اور پھر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔

قرآن میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں (مثلاً حضرت موسیٰؑ کی دعا، اصحاب کہف کی دعا، امرأۃ فرعون کی دعا) یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ انبیاء کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ مختلف علاقوں میں آئے اور وہ جہاں آئے وہیں کی مقامی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی دعا ان کی اپنی مادری زبان (مقامی زبان) میں ہوتی تھی نہ کہ عربی زبان میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ان کی دعا صرف معناً مذکور ہے نہ کہ لفظاً۔ اسی طرح حدیث میں بہت سے انبیاء کی دعائیں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ کی یہ دعا جو انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو سکھائی:

اللھم فارج الھم و کاشف الغم و مجیب دعوۃ المضطرین رحمن الدنیا و الآخرۃ رحیمھما انت ترحمنی فارحمنی برحمۃ تغننی بھا عن رحمۃ من سواک (رواہ البزار والحاکم والاصبھانی)

اے اللہ! مصیبت کو ہٹانے والے اور غم کو دور کرنے والے اور مجبور کی پکار کو سننے والے، دنیا اور آخرت کے رحمان اور رحیم، تو ہی دونوں کا رحمان اور رحیم ہے پس تو مجھ پر ایسی رحمت فرما جو مجھے تیرے سوا دوسروں سے مستغنی کردے۔

ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی زبان عربی نہیں تھی اس لئے یقینی طور پر یہ دعا انہوں نے اس زبان میں بتائی جو ان کی اور حواریوں کی پیدائشی زبان تھی۔ حدیث میں یہ دعا اگر عربی زبان میں نقل ہوئی ہے مگر یہ نقل بالمعنی ہے نہ کہ نقل بالالفاظ۔

قلبی دعا مطلوب ہے نہ کہ لفظی دعا

''فلاں دعا بہت مجرب ہے' اس کو پڑھا کرو''۔ ''فلاں ذکر کی بڑی فضیلت ہے' صبح و شام اس کا ورد کیا کرو''۔ اس قسم کی باتیں اکثر سننے میں آتی ہیں۔ بے شمار کتابیں لوگوں نے لکھ رکھی ہیں جن میں اس قسم کے ''مجربات'' جمع کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ کتنی بزرگی کی دکانیں اسی لئے قائم ہیں کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو دعاؤں اور اذکار کے قیمتی نسخے معلوم ہیں' لوگ وہاں حاضری دیتے ہیں' اور وہ پُر اسرار طور پر ان کو ایسے مجربات کی تلقین کرتے ہیں جو ان کو سینہ بہ سینہ پہنچے ہیں۔

مگر یہ ساری باتیں قطعاً بے اصل ہیں۔ دعا یا ذکر کوئی جادو کا منتر نہیں ہے جس کے سارے کمالات کچھ مقرر الفاظ میں چھپے ہوئے ہوں۔ اگر یہ خاص الفاظ مقرر طریقے پر زبان سے پڑھ دئے جائیں تو اس کی تاثیر ظاہر ہو جائے گی اور اگر الفاظ اور طریقے میں کچھ فرق ہو گیا تو منتر کا طلسماتی کمال ظاہر نہیں ہوگا۔ دعا یا ذکر دل کی کیفیات اور اندرونی تڑپ کا نام ہے نہ کہ پُر اسرار الفاظ کے کسی مجموعہ کا۔

قصہ مشہور ہے کہ کہیں ایک بند محل تھا۔ اس محل کے اندر بے شمار خزانہ بھرا ہوا تھا' مگر وہ کسی کنجی سے نہیں کھلتا تھا' بلکہ ایک منتر سے کھلتا تھا۔

ایک شخص کو اس محل کی تلاش ہوئی۔ برسوں تک پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومنے کے بعد اسے ایک شخص ملا جو اس جادوئی محل کا راز جانتا تھا۔ اس نے اس کا پتہ بتایا اور کہا کہ تم اس کے سامنے پہنچو تو کہنا ''کھل اے سم سم''۔ یہ کہتے ہی محل کا دروازہ کھل جائے گا اور تم اس میں داخل ہو جانا۔

اب آدمی نے سفر شروع کیا۔ چلتے چلتے بالآخر وہ خزانہ کے اس محل تک پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے اس کو کھولنے کا منتر بھول گیا۔ وہ محل کے بھاری دروازہ کے سامنے کھڑا ہو کر طرح طرح کے ملتے جلتے الفاظ دہراتا رہا: ٹم ٹم' بم بم' چم چم۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ کیونکہ وہ تو ایک خاص لفظ بولنے ہی سے کھلتا تھا اور آدمی وہ لفظ بھول چکا تھا۔

وہ دوبارہ محل کے عارف کی طرف روانہ ہوا اور دریاؤں اور بیابانوں کا سفر کر کے اس سے ملاقات کی۔ عارف نے دوبارہ اس کو بتایا کہ جادوئی محل کا منتر ''سم سم'' ہے۔ اب اس نے اس منتر کو خوب رٹ ڈالا اور دوبارہ سفر کر کے محل کے پاس پہنچا۔ اب وہ محل کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کو اس کا جادوئی منتر خوب یاد تھا۔ اس نے کہا ''کھل جا اے سم سم'' ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ محل کا دروازہ کھل گیا اور خزانوں کی چمکتی ہوئی دنیا اس کے سامنے آ گئی۔

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا اور ذکر بھی اسی طرح ''سم سم'' کی قسم کے منتر ہیں، مگر یہ دین سے انتہائی ناواقفیت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ اخبات و انابت (دل کا جھکاؤ اور توجہ) ہے نہ کہ لفظی طلسمات۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دیہاتی کا اونٹ گم ہو گیا۔ وہ بیتابانہ اس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ لمبی تلاش اور دوڑ دھوپ کے بعد جب اونٹ اس کو ملا تو اس کا شکر الٰہی کے جذبہ سے بھر گیا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ:

اللھم انت عبدی و انا ربک : خدایا تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔

لفظوں کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ کفر کا کلمہ ہے۔ مگر یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کو اتنے پسند آ گئے کہ اس کو خدا کے مقبول بندوں میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں ''اللہ ہمارے ظاہر کو نہیں دیکھتا، وہ ہمارے قلب اور ہمارے باطن کو دیکھتا ہے''۔

دعا اور ذکر دین کی سب سے اعلیٰ حقیقتیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ پراسرار قسم کی عربی منتر ہیں۔ ان کو رٹ کر خاص خاص وقت میں دہرا دو، اور محل کے دروازے کھل جائیں گے۔ دعا کی حقیقت بندے کا اپنے مالک کو پکارنا ہے۔ اسی طرح ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور محبت اس طرح دل پر چھا جائے کہ ہر وقت اس کی یاد آتی رہے۔ دعا اور ذکر وہی افضل ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے، خواہ وہ اپنی مادری زبان میں ہو۔ خواہ اونٹ والے کی طرح وہ بے ڈھنگے الفاظ میں کیوں نہ ادا ہوئی ہو۔

ایک دعا

حدیث کی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی بہت سی دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ دعائیں پیغمبر اسلام کی اندرونی شخصیت کو بتاتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے سینہ میں کس قسم کے احساسات کا طوفان برپا رہتا تھا۔ ان کے اندر کی دنیا کس قسم کے جذبات وخیالات سے ہمیشہ آباد رہتی تھی۔ ان میں سے ایک دعا وہ ہے جو ان الفاظ میں آپ کے زبان سے نکلتی تھی:

اللھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه و ارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه وارنا الاشیاء کما ھی (اے اللہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے اور اے اللہ ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ، ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

موجودہ دنیا میں حقیقتوں کے اوپر اشتباہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جو شخص صرف چیزوں کے ظاہر کو جانے وہ ان کو ان کی حقیقت کے اعتبار سے سمجھ نہیں سکتا۔ پیغمبر کو یہ احساس تڑپاتا ہے۔ وہ بیتابانہ اللہ کو پکار کر یہ کہنے لگتا ہے کہ اے اللہ مجھ کو حقیقت بینی کی نعمت عطا فرما تاکہ میں چیزوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھوں، میں ہر چیز کے بارے میں وہی درست رائے قائم کروں جو حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ہونا چاہئے۔ صحیح فکر کے بغیر سچی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح صحیح فکر کے بغیر صحیح عمل کا ظہور بھی ممکن نہیں۔ یہی احساس تھا جو شدت اختیار کر کے مذکورہ قسم کی دعا میں ڈھل گیا تھا۔ یہ دعا ایک مومنانہ قلب کی تصویر ہے جو پیغمبر کے سینہ میں اعلیٰ ترین درجہ میں موجود ہوتی ہے۔

اس دنیا کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ آدمی کو حق باطل کے روپ میں دکھائی دے اور باطل اس کو حق کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ اس سے بچنا اسی آدمی کیلئے ممکن ہے جو اللہ کی توفیق سے اتنا باشعور ہو جائے کہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق وہ گہرائی کے ساتھ دیکھنے لگے۔

دعا عبادت ہے

دعا کے معنی ہیں پکارنا۔ یہ لفظ جب شرعی اصطلاح کے طور پر بولا جائے تو اس کا مطلب ہوگا اللہ کو پکارنا' اللہ سے التجا کرنا۔ یہ دعا ایک عظیم عبادت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ 'الدعاء هو العبادة' (الترمذی' ابن ماجہ' احمد) یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدعاء مخ العبادة (الترمذی' کتاب الدعاء) یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔

دعا کا عبادت ہونا بتاتا ہے کہ دعا ایک ذاتی نوعیت کا عمل ہے۔ ہر آدمی کو اپنی دعا آپ کرنا ہے' جس طرح ہر آدمی اپنی عبادت آپ کرتا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے کہے کہ تم میری طرف سے نماز پڑھ دو' اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے کہے کہ تم میرے لئے دعا کردو۔

قرآن میں اہل ایمان کی یہ صفت بتائی گئی ہے: يدعون ربهم خوفاً وطمعا (السجدہ:16) یعنی وہ لوگ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف کے ساتھ اور امید کے ساتھ۔ کسی آدمی کا اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارنا انتہائی قسم کا ذاتی عمل ہے۔ یہ دعائیہ واقعہ کسی آدمی کے دل کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس قسم کی دعا ایک آدمی کو خود کرنا ہے۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا کہ کسی دوسرے شخص سے کہے کہ تم میری طرف سے خوف کر لینا یا میری طرف امید کر لینا۔

اس قسم کی دعا کسی انسان کے لئے اس کی عبدیت کا معیار ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوا اس کی زندگی میں ایسے لمحات آنے چاہئیں جب کہ اس کی روح اللہ کی یاد میں تڑپ اٹھے۔ اسکے دل و دماغ میں اللہ کے تصور سے زلزلہ پیدا ہو جائے۔ اس کے سینے میں تعلق باللہ کا سیلاب امنڈ پڑے اور پھر زلزلہ خیز کیفیت کے ساتھ وہ سراپا التجا بن کر اللہ سے دعا کرنے لگے۔

جس آدمی کے اندر یہ کیفیت پیدا نہ ہو' اس کا ایمان ہی اللہ کے نزدیک غیر معتبر ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ: من لم يسأل الله يغضب عليه (الترمذی' کتاب الدعوات) یعنی جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔

دعا ایک ایسا لطیف عمل ہے جو براہ راست خدا اور بندے کے درمیان پیش آتا ہے۔ اس عمل کے دروان کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہترین دعا وہ ہے جو تنہائیوں میں کسی بندۂ خدا کے سینے سے ابلتی ہے۔ ایک روایت میں جنتی انسان کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے: ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ (النسائی، موطا) یعنی وہ شخص جس نے اللہ کو تنہائی میں یاد کیا اور پھر اس کی دونوں آنکھیں بہہ پڑیں۔

ان نصوص کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دعا انتہائی ذاتی نوعیت کا ایک لطیف عمل ہے۔ وہ ہر مدعی ایمان کے لئے اس کی ربانیت کا اظہار ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ دعا ایسی چیز نہیں کہ آپ کسی مفروضہ بزرگ سے مل کر کہیں کہ آپ میرے لئے دعا کر دیجئے۔ اس قسم کی درخواست بلاشبہہ دعا کی تصغیر ہے۔ یہ گویا اللہ کی طرف دوڑنے کے بجائے انسان کی طرف دوڑنا ہے۔

اسی طرح لاؤڈ اسپیکر پر دعا کرنا بھی ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اس قسم کا مکبرانہ فعل ایک تقریر ہے نہ کہ دعا۔ حتی کہ یہ بھی حقیقی دعا نہیں کہ آپ کچھ الفاظ کو رٹ لیں اور ہر بار ان رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرا دیں۔ دعا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، قلبی تڑپ کا ایک عمل ہے، وہ رسمی الفاظ کے کسی مجموعے کا نام نہیں۔

صحیح البخاری میں کتاب الایمان کے تحت ایک باب کا ترجمہ باب ان الفاظ قائم کیا گیا ہے۔ دعاؤکم ایمانکم (تمہاری دعا تمہارا ایمان ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسا ایمان ویسی دعا۔ دعا ایمان کو ناپنے کا پیمانہ ہے۔ اگر آدمی کو گہرا ایمان حاصل ہوا ہے تو اس کی دعا بھی دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی ایک ربانی آواز ہوگی۔ وہ جب دعا کرے گا تو اس کا پورا وجود اس کی دعاؤں میں شامل ہو جائیگا۔ دعا اس کے لئے اپنے رب سے ملاقات کا لمحہ بن جائے گی۔ اس کی دعا اپنے رب سے سرگوشی (whisper) کے ہم معنی ہوگی، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ینا جی ربہ (مسند احمد)

اس کے برعکس، جس کا ایمان قلب میں اترا ہوا نہ ہو بلکہ صرف لفظی اقرار کے ہم معنی ہو، اس کی دعا بھی صرف لفظی اور رسمی دعا ہوگی۔ وہ کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرائے گا

مگر ان الفاظ کا اس کی قلبی کیفیات سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس کی دعا صرف تلفظ لسانی کے ہم معنی ہوگی نہ کہ روحانی کیفیت کے اظہار کے ہم معنی۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب تم اللہ سے دعا مانگو تو خوب لپٹ کر دعا مانگو۔ لپٹ کر دعا مانگنے کا مطلب کیا ہے' اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ یہ مثال بیٹے اور باپ کے معاملے سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر اس بندے اور خدا کے درمیان دعا کے معاملے کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

رام پور کا واقعہ ہے۔ وہاں ایک اسکول ماسٹر تھے۔ ان کی آمدنی زیادہ نہ تھی۔ ان کے بیٹے کو بائسیکل کا شوق ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے لئے ایک بائسیکل لے دیجئے۔ باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بیٹا کئی دن تک اپنے اس سوال کو دہراتا رہا۔ مگر باپ اس کو نظر انداز کرتا رہا۔ ایک دن بیٹے نے زیادہ اصرار کیا تو باپ نے غصہ ہو کر کہا کہ میرے پاس بائسیکل خریدنے کے لئے پیسہ نہیں۔ اب اگر تم نے بائسیکل کے لئے کہا تو میں تم کو ماروں گا۔ یہ سن کر بیٹا رونے لگا۔ اس نے روتے ہوئے کہا..... آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں' آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔

بیٹے کے یہ الفاظ سن کر باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے کہا کہ اچھا میرے بیٹے' میں ضرور تم کو بائسیکل دوں گا۔ اور پھر پیسہ کا انتظام کر کے اگلے دن اس نے بائسیکل خریدی اور بیٹے کو دے دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بیٹے نے مذکورہ الفاظ کہے تو گویا باپ اور بیٹا دونوں ایک ترازو پر آ گئے۔ باپ نے محسوس کیا کہ اگر وہ بائسیکل کا انتظام نہ کرے تو گویا اس کی پدریت (fatherhood) ہی مشتبہ ہو جائے گی۔

باپ اور بیٹے کا یہ واقعہ بندے اور خدا کے معاملے کو بتاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کونسی دعا ہے جو ضرور قبول ہوتی ہے' جو لوٹائی نہیں جاتی۔ یہ وہ دعا ہے جس میں بندے کی پوری ہستی دعا میں ڈھل جاتی ہے۔ جب دعا کا قبول ہونا خدا کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن جاتا ہے جتنا بڑا انسان کے لئے۔

غالباً دعا کی یہی قسم ہے جس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: رب أشعث

أغبر مدفوع بالأبواب لو أقسم على الله لأبره (صحیح مسلم، کتاب البر) یعنی بہت سے لوگ ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے ہیں، جن کے کپڑے گرد آلود ہیں، جن کے اوپر لوگوں کے دروازے بند ہیں، اگر وہ اللہ پر قسم کھائیں تو اللہ ان کی قسم پورا کرے گا۔

اس حدیث میں اس انسان کی تصویر بتائی گئی ہے جو اللہ کے کام میں اتنا زیادہ مشغول ہوا کہ اس کو بال اور کپڑے کا اہتمام کرنے کی بھی فرصت نہ رہی۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے کام میں اس طرف وقف کر دیں ان کا معاملہ اللہ کا معاملہ بن جاتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کے لئے دعا کرتے ہیں تو وہ ایک ایسی چیز کو مانگنا ہوتا ہے جس کی قبولیت کا فیصلہ پیشگی طور پر کیا جا چکا ہے۔

یہ دعا کوئی سادہ چیز نہیں ہے، یہ مومن کے لئے ایک عجیب سرمایہ ہے۔ دعا کے سرمایہ ہونے کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے خلاف آپ سے کوئی ایسی غلطی ہوگئی جس کی تلافی کی کوئی اور صورت نہ ہو تو آپ اس کے لئے اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہیں کہ اے اللہ، تو میری طرف سے اس کے حق میں دعائے خیر لکھ دے۔ آپ کے اوپر کسی کا احسان ہے اور آپ اس کے احسان کا بدلہ نہ دے سکتے ہوں تو آپ اس کے حق میں بہترین دعائیں کریں۔ آپ کسی معذوری کی بنا پر کوئی دینی کام نہ کر سکیں تو آپ ان لوگوں کے لئے اللہ کی مدد کی دعا کریں جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے دل میں کسی کے خلاف شکایت آجائے تو آپ اللہ سے یہ درخواست کریں کہ وہ آپ کے دل سے شکایت کو نکال دے اور اس کی جگہ خیر خواہی کے جذبات رکھ دے۔

امام ابن تیمیہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب قرآن کی کسی آیت کو سمجھنے میں انہیں مشکل پیش آتی تو وہ وضو کر کے کسی ویرانے میں چلے جاتے اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے یہ کہتے کہ اے ابراہیم کو علم دینے والے، مجھے بھی علم دے (یا معلم ابراهیم علمنی)

حقیقت یہ ہے کہ دعا ہر مشکل کے وقت مومن کا سہارا ہے۔ وہ ہر مشکل مسئلے کا حل ہے۔ دعا بلاشبہہ ایک طاقت ہے، سب سے بڑی طاقت۔ دعا اللہ سے ملاقات کا لمحہ ہے۔ مگر یہ لمحہ غافل لوگوں کے حصے میں نہیں آتا۔ یہ قیمتی لمحہ صرف اسی انسان کے لئے مقدر ہے جو اپنے دل کے اندر اعلیٰ ربانی کیفیت کو بیدار کر چکا ہو۔

دعا کی طاقت

ہیون سانگ (Hsuan-tsang) ایک چینی بدھسٹ ہے۔ وہ ۶۰۲ء میں پیدا ہوا اور ۶۶۴ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۶۲۹ء میں چین سے سفر کر کے انڈیا آیا۔ انڈیا کے بارہ میں اس کا سفر نامہ بہت تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں قیام کے آخری زمانہ میں ہیون سانگ کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ ایک سفر کے دوران کچھ بحری قزاقوں نے اس کو پکڑ لیا۔ یہ لوگ ہندو دیوی دُرگا کے پجاری تھے۔ انہوں نے ہیون سانگ کو اپنی دیوی کے نام بلیدان کرنا چاہا۔ سانگ نے کافی احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک بودھ درویش ہے اور صرف سچائی کی تلاش میں نکلا ہے۔ مگر بحری قزاقوں نے اس کی چیخ و پکار کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بظاہر اس کی موت یقینی ہوگئی۔

ہیون سانگ اس وقت کشتی پر سوار تھا۔ آخر کار وہ خاموش ہو کر دھیان اور دعا میں مصروف ہو گیا۔ جس وقت وہ دعا اور مراقبہ میں مشغول تھا، سمندر میں زبردست طوفان اٹھا موجوں کے تھپیڑے نے کشتی کو گھیر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر بحری قزاق اتنا گھبرائے کہ انہوں نے ہیون سانگ کو چھوڑ دیا اور شرمندہ ہو کر اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگنے لگے:

While he was absorbed in meditation, a violent storm arose that buffeted the boat. The pirates were so terrified that they freed the holy monk and asked for forgiveness and repentance. (8/1126)

چینی سیاح کے ساتھ یہ جو واقعہ پیش آیا۔ وہ قرآن کے اس بیان کے مطابق تھا کہ جب کوئی آدمی اضطرار اور مجبوری کی حالت کو پہنچ جائے اور اس وقت وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے اور اس کی مصیبت کو اس سے دور کر دیتا ہے (النمل ۶۲) اس میں مومن اور غیر مومن کی کوئی تفریق نہیں۔ جو بندہ بھی اپنے کسی نازک وقت میں اپنے رب کو پکارے گا وہ اس کی طرف سے اس کا جواب پائے گا۔

اس قسم کے واقعات ایک طرف خدا کے وجود کا ثبوت ہیں، اور دوسری طرف وہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان تنہا نہیں بلکہ اس کا ایک پاسبان ہے جو ہر مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے۔

حدیثِ دعا

ان الدعاء هو العبادة (احمد) — دعا ہی عبادت ہے

الدعاء مخ العبادة (ترمذی) — دعا عبادت کا مغز ہے

من لم یسأل الله یغضب علیه (ترمذی)

جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے غضب ناک ہوتا ہے

لایرد القضاء الا الدعاء (ترمذی) — قضا کو صرف دعا ہی ٹال سکتی ہے

ما من احد یدعوا بدعاءٍ الا 'اتاه الله ماسأل او کف عنه من السوء مثله مالم یدع باثم او قطعیة رحم (ترمذی)

کوئی شخص جب اللہ سے دعا کرتا ہے تو اللہ یا تو اسکو وہ چیز دے دیتا ہے جو اس نے مانگی تھی یا اس کے برابر کوئی بلا اس سے روک دیتا ہے، جب تک کہ وہ کسی گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔

لیس شئی اکرم علی الله من الدعاء (ابن ماجہ)

اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں

سلو الله من فضله فان الله یحب ان یسال (ترمذی)

اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ کیوں کہ اللہ پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے

ان الدعاء ینفع مما نزل و مما ینزل فعلیکم عباد الله بالدعاء (احمد)

دعا ان چیزوں کے لئے بھی مفید ہے جو اتر چکی ہیں اور ان چیزوں میں بھی جو ابھی نہیں اتریں۔ تو اے اللہ کے بندو، تم ضرور دعا مانگو۔

یسأل احدکم ربه حاجته کله حتیٰ یسأل شسع نعله اذا نقطع (ترمذی)

تم میں سے ہر ایک کو اپنے رب سے اپنی تمام حاجت مانگنا چاہئے، یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی خدا سے مانگے۔

دعا کرنے والا اپنے آپ کو عاجز مطلق کے مقام پر رکھتا ہے اور خدا کو قادر مطلق کے مقام پر۔ دعا ایک طرف اپنی حیثیتِ واقعی کا اقرار ہے اور دوسری طرف خدا کی حیثیتِ واقعی کا اعتراف۔ یہ حقیقت پسندی کی آخری شکل ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ اس دنیا کا سب سے بڑا عمل ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف سے بڑا کوئی عمل اس امتحان کی دنیا میں نہیں۔

دعا کیوں قبول نہیں ہوتی

لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں اور ہماری دعا قبول نہیں ہوتی۔ بزرگ نے جواب دیا: اس لئے کہ آپ لوگ خدا سے وہ چیز مانگتے ہیں جو آپ دوسرے انسانوں کو دینے کے لئے تیار نہیں۔ آپ خدا سے مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو ظالموں کے ظلم سے بچائے۔ مگر آپ میں سے ایک شخص جب کسی کو کسی کے اوپر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے ظلم کا مزہ چکھانے سے باز نہیں رہتا۔ آپ خدا سے جان و مال کی امان مانگتے ہیں مگر آپ میں سے ایک شخص کو جب موقع ملتا ہے تو وہ اپنے بھائی کے جان و مال کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے۔ آپ خدا سے باعزت زندگی مانگتے ہیں مگر آپ میں سے ایک شخص اگر کسی کے اوپر قابو پالے تو وہ اس کو بے عزت کر کے خوش ہوتا ہے۔ آپ خدا سے مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو دشمن قوموں کی سازش سے بچائے مگر آپ میں سے ایک شخص کو اگر کسی سے اختلاف ہو جائے تو اس کو اکھاڑنے کے لئے وہ ہر قسم کی سازشیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔

دعا کی قبولیت کی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی دعا مانگنے میں سنجیدہ ہو۔ اس کی دعا اس کی پوری ہستی کی پکار ہو نہ کہ محض زبان کی حرکت سے نکلے ہوئے الفاظ۔ جب آدمی سنجیدہ ہو تو اس کی زندگی تضاد سے خالی ہو جاتی ہے۔ اس کی دعا میں اور اس کے عمل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اگر ایک شخص فی الواقع ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور دوسرے آدمی کے ظلم کو قابل شکایت سمجھ رہا ہے تو ناممکن ہے کہ وہ خود اپنے دائرے میں ظالم بن جائے۔ اپنے دائرہ اختیار میں ظلم کرنا اور دوسرے کے ظلم پر احتجاج کرنا ایسا تضاد ہے جو ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے کہنے میں سنجیدہ نہیں ہے، وہ قول بلا فعل (صف) کی سطح پر ہے۔ اور جو شخص قول بلا فعل کی سطح پر ہو اس کی دعا اس کے منہ پر ماردی جاتی ہے نہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا شرف حاصل کرے۔ ایک شخص لوگوں کو باہم لڑاتا پھرتا ہو اور خدا سے دعا کرے کہ "خدایا لوگوں کو متحد کر دے" تو یہ اللہ کی نظر میں دعا نہیں ہے بلکہ ایک مذاق ہے جو دعا کرنے والے کو صرف سزا کا مستحق بناتی ہے۔ دعا کی قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی بندوں کو وہی دے رہا ہو جو خدا سے اپنے لئے مانگ رہا ہے۔ اس سے دوسروں کو ہی رحمت و عنایت ملے جس رحمت و عنایت کی درخواست وہ خدا سے اپنے لئے کر رہا ہے۔ اس کے بغیر دعا ایک جرم ہے نہ کہ حقیقۃً اللہ کے سامنے پیش کی جانے والی درخواست۔

توبہ نے طاقت ور بنا دیا

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جادوگر جب فرعون کے پاس جمع ہوئے تو انہوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم موسیٰ کے مقابلہ میں غالب رہے تو ہم کو اس کا انعام تو ضرور ملے گا۔ فرعون نے کہا ہاں۔ اس کے بعد جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں جو دیکھنے والوں کو رینگتے ہوئے سانپ کی مانند نظر آنے لگیں۔ اب حضرت موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا۔ آپ کا عصا اژدھا بن کر گھوما تو اس کا اثر یہ ہوا کہ جادوگروں کی ہر لکڑی لکڑی اور ہر رسی رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر سمجھ گئے کہ موسیٰ نے جو چیز دکھائی ہے وہ جادو نہیں بلکہ خدائی معجزہ ہے۔ ان کا سینہ حق کے لئے کھل گیا۔ اور انہوں نے اسی وقت ایمان قبول کر لیا۔ فرعون غضب ناک ہو کر بولا: تم لوگ موسیٰ کے مومن بن گئے قبل اس کے کہ میں تم کو اس کی اجازت دوں۔ یہ تم لوگوں کی خفیہ سازش ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور پھر تم سب لوگوں کو سولی پر چڑھا دوں گا (اعراف)..... جادوگروں نے جواب دیا: اس ذات کی قسم جس نے ہم کو پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ خدا کی روشن نشانیوں کے مقابلہ میں ہم تم کو ترجیح دیں۔ تم جو کچھ کرنا چاہو کر لو۔ تم صرف اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہو اور اللہ زیادہ اچھا ہے اور وہ باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ)

وہی جادوگر جو ابھی فرعون کے سامنے خوشامدی باتیں کر رہے تھے اور اس کے انعام اور اعزاز کے طالب تھے وہی تھوڑی دیر بعد اتنے دلیر اور بلند حوصلہ ہو گئے کہ فرعون کی انہیں کوئی پروا نہ رہی۔ حتیٰ کہ فرعون کی طرف سے سخت ترین سزا کی دھمکی بھی انہیں مرعوب نہ کر سکی۔ وہ کیا چیز تھی جس نے جادوگروں کو اچانک پستی سے بلندی اور بزدلی سے بہادری تک

پہنچادیا۔ وہ ایمان کی طاقت تھی۔ انہوں نے انسانوں سے گزر کر خدا کو پالیا تھا' پھر ان کو انسانوں کا ڈر کیوں ہوتا۔

شہر کے مسلم محلّہ کو تخریب کاروں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ مسلمان اپنے گھروں سے نکلے تو تخریب کاروں نے پتھر پھینکنے شروع کیے۔ مسلمانوں نے بھی اس کے جواب میں پتھر پھینکے۔ تخریب کاروں کو جب پتھراؤ سے کامیابی نظر نہ آئی تو انہوں نے بندوقوں سے فائر کیے جس سے کچھ مسلمان زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان بھاگے اور اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ اب تخریب کاروں کا حوصلہ بڑھا۔ وہ آگے بڑھ کر محلّہ میں گھس گئے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں میں آگ لگانا شروع کر دیا۔

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ اس کے بعد محلّہ کے ایک ''دادا'' کو اللہ نے ہمت دی اور اس نے مسئلہ کو حل کر دیا۔ اس شخص میں اور کوئی برائی نہ تھی۔ البتہ وہ شراب پیتا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں داخل ہوا۔ اس نے تیمّم کیا اور سجدہ میں گر پڑا۔ سجدہ کی حالت میں اس نے دعا کی: خدایا آج تو ہماری عزت رکھ لے اور ہماری مدد کر۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ اس نے یہ دعا کی اور اس کے بعد پڑوسی کی بندوق لی اور تھیلہ میں کارتوس بھر کر مجمع میں گھس گیا۔ اس نے چن چن کر تخریب کاروں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ اگرچہ وہ خود بھی ہر وقت تخریب کاروں کے نشانہ کی زد پر تھا مگر اس وقت ڈر اس کے دل سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔ تخریب کاروں نے جب دیکھا کہ ان کے بہت سے ساتھی خاک وخون میں تڑپ رہے ہیں اور ''ہائے مار ڈالا'' کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتا ہے (فاطر ۱۰) مذکورہ مسلمان کی دعا کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اس نے جب اپنی دعا کے ساتھ شراب چھوڑنے کا عہد کیا تو اس نے ایک نیک عمل کیا۔ اس نیک عمل کی وجہ سے اس کی دعا اوپر اٹھ کر فوراً خدا کی بارگاہ میں پہنچی اور مقبول ہوئی۔ جب بھی آدمی اپنی دعا کے ساتھ اس قسم کا کوئی نیک عمل کرے تو اس کی دعا ضرور قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہے۔ دعا کے ساتھ اس کے موافق نیک عمل دعا کے معاملہ میں آدمی کے سنجیدہ ہونے کا ثبوت ہے' اور جب آدمی اپنی مانگ میں سنجیدہ ہو اس کی مانگ ضرور پوری کی جاتی ہے۔

اس واقعہ کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ جب آدمی نے یہ کہا کہ ''خدایا میں آج سے شراب کو چھوڑتا ہوں تو میری مدد کر'' تو اس نے اپنی طاقت کو بڑھایا۔ کیوں کہ اب اس نے خدا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اگر وہ صرف ''خدایا مدد کر'' کے الفاظ بولتا تو اس سے اس کے اندر وہ یقین نہ آتا۔ کیوں کہ یہ چھپا ہوا خیال پھر بھی اس کے دل میں باقی رہتا کہ میں خدا کو پکار رہا ہوں حالاں کہ میں خدا کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جب اس نے شراب چھوڑنے کا عزم کیا تو بھرپور طور پر اس کو یہ امید پیدا ہوگئی کہ اب خدا ضرور میری مدد کرے گا۔ کیونکہ اب اس نے اپنے اور خدا کے درمیان پڑے ہوئے پردہ کو ہٹا دیا تھا۔ پہلی صورت میں اس کی مثال اگر چور کی سی تھی تو اب اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگئی جس نے سامان کی قیمت اس کے دکاندار کو ادا کر دی ہو۔ اس کی توبہ نے اس کو نڈر بنا دیا اور اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ توبہ کے فوراً بعد اس کے اندر سے احساسِ جرم نکل گیا۔ اس کا یہ اندیشہ مٹ گیا کہ میں خدا سے دور ہوں۔ اب وہ خدا کی مدد کو اپنے حق میں یقینی سمجھنے لگا۔ اس کے اور خدا کے درمیان جو رکاوٹ تھی جب اس رکاوٹ کو اس نے دور کر دیا تو اندیشوں کے تمام غبار اس کے دل سے ہٹ گئے۔ خدا اس کو اپنا نظر آنے لگا' کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بنا چکا تھا۔

مقبول دعا

دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے نہ کہ محض زبانی الفاظ سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگنا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ مانگنا وہی مانگنا ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہوگئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو ''خدایا! مجھے اپنا بنالے''۔ مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے، تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں۔ اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے، وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی۔ خواہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کئے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کردے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور خدا آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دین داری مانگیں اور خدا آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور خدا آپ کو شخصیت پرستی کی کوٹھری میں بند کردے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا، میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا، یہ ناممکن ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ ناممکن ہے۔

کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آ کر آواز دیتا ہے ..... ''کون ہے جو مجھ سے مانگے تا کہ میں اسے دوں'' مگر جنہیں لینا ہے وہ اس سے غافل اور اندھے بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

''میرے لئے ایک بائسیکل خرید دیجئے'' بیٹے نے باپ سے کہا۔ باپ کی آمدنی کم تھی۔ وہ بائسیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا کہ ''میں نے کہہ دیا کہ میں بائسیکل نہیں خریدوں گا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا''۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا: ''آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں''۔ اس جملے نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو میں تمہارے لئے بائسیکل خریدوں گا' اور کل ہی خریدوں گا''۔ یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اگلے دن اس نے پیسے کا انتظام کر کے بیٹے کے لئے ایک نئی بائسیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی' جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہو گئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطے پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا کہ وہ خود اس کے لئے تھی۔

اس واقعے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دعا کی وہ کونسی قسم ہے جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امنڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی ''نصاب'' ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین اور آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ ''مانگنے والا'' اور ''دینے

والا' دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا' محض لغت کا ایک لفظ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہوجاتے ہیں قادر مطلق' عاجز مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: لا یرد القضاء الا الدعاء (الترمذی' کتاب القدر' ابن ماجہ) یعنی قضا وقدر کے فیصلے کو صرف دعا بدل سکتی ہے۔ خدا نے اس دنیا کا نظام اسباب وعلل کی بنیاد پر قائم کیا ہے' اور پھر انسان کو مکمل آزادی دے دی ہے۔ اب انسان اپنی آزادی کے مطابق' عمل کرتا ہے اور خدا کے قائم کردہ نظام اسباب وعلل سے مطابقت یا مخالفت کی بنیاد پر اس کا اچھا یا برا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظام بالکل حتمی ہے۔ کوئی آدمی خواہ مخلص ہو یا غیر مخلص اس کو بہر حال اس نظام کو بھگتنا ہے۔ کسی بھی شخص کے لئے اس نظام کو مسنوخ نہیں کیا جاتا۔

اس معاملے میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ دعا کا ہے۔ کوئی آدمی جب سچی دعا کرتا ہے اور اس وقت اگر خدا اس کی دعا قبول کرلیتا ہے وہ اسباب کے نظام میں مداخلت کرکے اس کا راستہ ہموار کردیتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس بات کا کہ دعا' قضا وقدر کو بدل دیتی ہے۔

لیکن دعا الفاظ کی تکرار کا نام نہیں ہے۔ حتی کہ قرآنی دعائیں یا ماثور دعائیں بھی اگر صرف رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار ہوں تو وہ بھی مؤثر نہیں ہوسکتیں۔ نظام قضا کو بدلنے کے لئے وہ دعا درکار ہے جو دل کو پھاڑ کر کی جاتی ہے۔ جو دل کی پھٹن کی آواز ہوتی ہے۔ جس میں آدمی کی پوری شخصیت شامل ہوجاتی ہے۔

اس قسم کی دعا کی قبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والے کا ذہنی تزکیہ اتنا زیادہ ہوچکا ہو کہ اس کی سوچ خدا کی سوچ بن جائے۔ ایسا آدمی وہی دعا کرے گا جو خدا کے نزدیک قابل قبول ہوتی ہے۔ اس کی زبان سے ایسی دعا نہیں نکلے گی جو خدا کی سنت کے مطابق' قابل قبول ہی نہیں۔

دعا کب قبول ہوتی ہے

قرآن میں مختلف مقامات پر دعا کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

ادعوا ربکم تضرعا خفية انه لا يحب المعتدين ولا تفسدوا في الارض بعد اصلاحها وادعوه خوفا وطمعا ان رحمت الله قريب من المحسنين (اعراف ٥٦-٥٥)

پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔یقیناً وہ پسند نہیں کرتا حد سے نکل جانے والوں کو۔اور مت خرابی مچاؤ زمین میں اس کی درستی کے بعد۔اور پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے۔یقیناً اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے۔

اس موقع پر احسان کا مطلب ہے دعا کے موافق عمل کرنا۔دوسری جگہ یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

ومن احسن قولا ممن دعا الى الله وعمل صالحا وقال انني من المسلمين (حم سجدہ ٣٣)

اور کون شخص ہے بہتر بات میں اس شخص سے کہ پکارے اللہ کی طرف اور صالح عمل کرے اور کہے کہ میں حکم بردار ہوں۔

دعا کیا ہے۔بندے کا اعترافِ عجز اپنے رب کے سامنے۔جب ایک شخص اللہ پر اس حد تک یقین اور بھروسہ کر لیتا ہے کہ اس کی ساری امیدیں بس ایک اللہ سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔اللہ کے سوا کسی اور سے نہ اس کو پانے کی امید ہوتی ہے اور نہ چھننے کا اندیشہ۔اس

وقت اس کی زبان سے جو بیتابانہ کلمات نکل پڑتے ہیں' اسی کا نام دعا ہے۔ بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ میرے رب! مجھے اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ تیرے سوا کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔ تیرے سوا کوئی کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔

دعا کے یہ الفاظ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعا ہیں جب کہ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) سے اس کی تصدیق ہو رہی ہو۔ آدمی اپنے رب سے اپنے لئے جس رحمت اور عفو و درگزر کا طالب ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت اور عفو و درگزر کا وہی طریقہ اختیار کرنا زمین کی اصلاح ہے۔ اور جب ایسا ہو کہ آدمی اپنے لئے تو رحمت اور عفو و درگزر کا امید وار ہو اور خود دوسرے انسانوں کے ساتھ سرکشی اور بے پروائی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کا نام زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ اللہ کے سامنے حد بندگی میں ہونے کا اقرار کرنا اور دنیا کی زندگی میں جب دوسرے انسانوں سے عملی سابقہ پیش آئے تو حد بندگی سے نکل جانا ایسا تضاد ہے جو ایک طرف زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے اور دوسری طرف آدمی کی دعا کو اللہ کی نظر میں بالکل بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی اپنی دعا کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر اس بات کا ثبوت اس کو انسانی تعلقات ہی میں دینا ہے کہ وہ اپنی دعا میں محسن ہے یا نہیں۔ جو شخص انسانی تعلقات میں اپنی دعائیہ حیثیت کو بھول جائے اس کی مثال ایسے آدمی کی ہے جس نے زبان سے بڑے بڑے دعوے کئے مگر جب اس کا امتحان لیا گیا تو وہ صفر سے زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکا۔

دعا اور اعتراف

تاریخ اسلام کا ایک واقعہ وہ ہے جس کو مواخاۃ کہا جاتا ہے۔ مکہ کے مسلمان جب مہاجر کی حیثیت سے مدینہ میں آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ دو دو شخص اللہ کی راہ میں بھائی بھائی بن جاؤ (تآخوا فی اللہ اخوین اخوین) اس ہدایت کے مطابق ہر انصاری نے ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنالیا۔ انصار نے اپنے تمام اثاثہ کو تقسیم کر کے آدھا خود لیا اور آدھا اپنے مہاجر بھائی کو دیدیا۔ اس مواخاۃ کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس معاملہ میں انصار نے یک طرفہ طور پر جس کمالِ ایثار کا ثبوت دیا اس کی کوئی مثال پوری معلوم تاریخ میں نہیں ملتی۔ انصار کے اعلیٰ سلوک سے خود مہاجرین بے حد متاثر تھے:

قال الامام احمد: حدثنا یزید، اخبرنا حمید عن انس، قال: قال المهاجرون: یا رسول الله مارأینا مثل قوم قدمنا علیهم احسن مواساة فی قلیل، ولا احسن بذلا من کثیر، لقد کفرنا المؤونة واشرکونا فی المهنا، حتی لقد خشینا ان یذهبوا بالاجر کله قال: لا، ما اثنیتم علیهم ودعوتم الله لهم

حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ مہاجرین نے کہا کہ اے خدا کے رسول، جس قوم کے یہاں ہم آئے ہیں، ان سے بہتر قوم ہم نے نہیں دیکھی۔ وہ کم میں بہترین ہمدردی کرنے والے ہیں اور زیادہ میں بہترین خرچ کرنے والے ہیں۔ وہ محنت میں ہماری طرف سے کافی ہو گئے اور پیداوار میں ہم کو شریک کرلیا۔ حتیٰ کہ ہم کو ڈر ہے کہ سارا اجر انہیں کو نہ مل جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرو اور اللہ سے ان کے لئے دعا کرتے رہو (سیرۃ ابن کثیر ۲/۳۲۸)۔

اس حدیث سے نہایت اہم اسلامی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ زید کو بکر سے کچھ ملے مگر زید کے پاس کوئی مادی چیز لوٹانے کے لئے نہ ہو تو وہ کیا کرے۔ ایسی حالت میں زید کو چاہئے کہ وہ بکر کے عطیہ کا کھلے دل سے اعتراف کرے۔ اعتراف کا یہ احساس اتنا زیادہ گہرا ہو کہ زید کے دل سے بکر کے لئے دعائیں نکلنے لگیں..... مال والے کے پاس دینے کے لئے اگر مال ہے، تو بے مال والے کے پاس بھی دینے کے لئے ایک چیز موجود ہے، اور وہ دعا اور اعتراف ہے۔ اور بلاشبہ دعا اور اعتراف کی اہمیت کسی مادی عطیہ سے کم نہیں۔

حسد کے بجائے دعا

لطیفہ ہے کہ ایک غریب دیہاتی تھا۔ وہ معاشی اعتبار سے بہت پریشان رہتا تھا۔ کسی شخص نے اس سے کہا کہ تم اکبر بادشاہ کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ ہر مانگنے والے کو دیتا ہے۔ وہ تم کو بھی ضرور دے گا اور تمہارا معاشی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دیہاتی آدمی نے کہا کہ اکبر بادشاہ کو کس نے دیا ہے۔ بتانے والے نے بتایا کہ خدا نے۔ دیہاتی نے کہا کہ پھر ہم خدا ہی سے کیوں نہ مانگیں، ہم اکبر سے کیوں مانگیں۔

اس کے بعد وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور سنسان جنگل کی طرف چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنا میلا کپڑا زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ کر خدا سے دعا کرنے لگا۔ اس نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا: اے اکبر کو دینے والے، مجھے بھی دیدے۔ وہ اسی طرح دعا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوا اور اس نے اپنا کپڑا اٹھایا تو اس کے نیچے اشرفیوں کی بھری ہوئی تھیلی موجود تھی۔ یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے دماغ اور اونچے پڑھے لکھے لوگ اپنے شعور اور کردار کے اعتبار سے اس سطح پر بھی نہیں ہیں جہاں مذکورہ دیہاتی آدمی تھا۔

آج یہ حالت ہے کہ جب بھی کوئی شخص یہ دیکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اس سے بڑھ گیا ہے، خواہ یہ بڑھنا مال کے اعتبار سے ہو یا حیثیت کے اعتبار سے، تو فوراً وہ حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے میں بڑھنے والے آدمی کے خلاف نفرت اور جلن کی کبھی نہ ختم ہونے والی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حسد اور جلن میں مبتلا ہونے والے لوگ اگر یہ سمجھیں کہ کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دئے سے ملا ہے، وہی کم بھی دیتا ہے اور وہی زیادہ بھی دیتا ہے، تو وہ بھی وہی کریں جو مذکورہ دیہاتی نے کیا۔ وہ پانے والے انسان کے بجائے دینے والے خدا کی طرف دوڑیں۔ وہ خدا کو پکارتے ہوئے کہیں کہ جس طرح تو نے میرے بھائی کو دیا ہے اسی طرح تو مجھے بھی دیدے۔ اگر لوگوں میں یہ مزاج آجائے تو سماج کی تمام برائیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

کسی کی بڑائی کو دیکھ کر اپنی کمی کا احساس ابھرنا بذات خود ایک فطری جذبہ ہے۔ اس جذبہ کا رخ اگر خدا کی طرف ہو تو وہ صحیح ہے اور اگر اس کا رخ آدمی کی طرف ہو تو غلط۔

دعا بھی عمل

ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ مکی دور میں قبیلہ دوس کے ایک شخص طفیل بن عمرو الدوسی آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے آپ سے قرآن کو سنا اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپ کی اجازت سے وہ اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور ان کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا مگر قبیلہ کے لوگوں نے انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ طفیل بن عمرو دوبارہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ قبیلہ دوس کے لوگ حق کے معاملہ میں سرکشی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے خلاف بد دعا کیجئے۔ آپ نے اس کے برعکس ہاتھ اٹھایا اور ان کے حق میں دعا کرنا شروع کیا: اے اللہ، تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے، اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ پھر آپ نے طفیل بن عمرو سے کہا کہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس جاؤ اور اس کو دوبارہ دعوت دو۔ اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو (سیرت ابن ہشام، ج ا ص ۴۰۹)

یہ دعا اور یہ نصیحت کوئی سادہ سی بات نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے طفیل بن عمرو کو منفی نفسیات سے نکل کر مثبت نفسیات کی طرف موڑ دیا۔ جن لوگوں کے بارے میں ان کے اندر بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا ان کے لئے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ بیدار کر دیا۔ جس معاملہ میں طفیل بن عمرو صرف حال کو دیکھ رہے تھے۔ اس معاملہ میں آپ نے ان کے اندر مستقبل کو دیکھنے کی نظر پیدا کر دی۔

دعا ایک اعتبار سے خدا سے مانگنا ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ اپنی نفسیات کی صالح تربیت ہے۔ وہ اپنے اندر ربانی طاقت کو بیدار کرنا ہے۔ طفیل بن عمرو جب اس نئی نفسیات کے ساتھ دوبارہ اپنے قبیلہ میں گئے تو وہ گویا ایک نئے انسان بن چکے تھے۔ اب وہ اس قابل تھے کہ زیادہ مؤثر انداز میں حق کی دعوت ان لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا۔ پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا۔

جس سوسائٹی میں لوگ ایک دوسرے کے اتنے خیر خواہ بن جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے لئے خدا سے دعا کرنے لگیں وہاں اس کا لازمی فائدہ یہ ہوگا کہ پوری سوسائٹی میں مثبت نفسیات کو فروغ حاصل ہوگا، اور بلاشبہ بہتر سوسائٹی بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری جو چیز مطلوب ہے وہ یہی مثبت نفسیات ہے۔

دعا کے موافق عمل

اللھم انی اعوذ بک من الفقر و القلة والذلة واعوذبک من اَن اَظْلِمَ او اُظْلَمَ (نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں محتاجی سے اور کمی سے اور ذلت سے۔ اور میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے۔

دعا آدمی کی تڑپ کا اظہار ہے۔ دعا یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کے لئے بے پناہ خواہش مند ہو، وہ اپنا پورا وجود اس کے لئے لگائے ہوئے ہو۔ اور پھر اسی کو وہ اپنے رب سے بھی مانگے۔ جب آدمی اپنے آپ کو ہمہ تن کسی چیز میں لگا دے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی کا وہ چرچا کرتا ہے، اسی کے لئے دعائیں اس کی زبان سے جاری ہونے لگتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا سنجیدگی کی آخری حد پر جا کر نکلتی ہے۔ اب جو شخص حقیقی معنوں میں محتاجی سے بچنا چاہتا ہو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ خود ایسا عمل کرے جو اس کو محتاجی کی طرف لے جانے والا ہو۔ جو شخص ناداری کو ایک نازک امتحان سمجھتا ہو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو نادار بنانے والا عمل نہیں کرے گا۔ جو شخص ذلت سے ڈرتا ہو وہ کبھی ایسا اقدام نہیں کرے گا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ذلت کی حالت میں جا پڑے۔ جو آدمی اپنے آپ کو ظالم کے خانہ میں نہ دیکھنا چاہتا ہو وہ کبھی خود سے ظالمانہ کارروائی نہیں کرے گا۔ جو شخص اپنے آپ کو مظلومی کی حالت میں دیکھنا نہ چاہے وہ ایسے معاملہ میں کبھی نہیں کود سکتا جو نتیجۃً اس کو مظلومی کی حالت میں پہونچا دینے والا ہو۔

جو شخص اپنی دعا میں سنجیدہ ہو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا کہ جس چیز سے بچنے کے لئے وہ خدا سے دعا کرے، دعا کے بعد وہ خود اسی چیز میں ملوث ہو جائے۔ خدا سے وہ مشرق کی سمت میں سفر کی توفیق مانگے اور دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی سواری مغرب کی سمت میں دوڑا دے۔

مفاد پرستی

ایک لطیفہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر جب یروشلم گئے تو اس وقت کے اسرائیلی وزیراعظم مناہن بے جن ان کو دیوار گریہ کے پاس لے گئے جو یروشلم میں یہودیوں کی مقدس ترین جگہ ہے۔ وہاں جمی کارٹر نے دعا کرتے ہوئے کہا: ''اے خدا عربوں اور اسرائیل کو امن تک پہونچنے میں مدد کر''۔ بے جن نے کہا ''آمین''۔ اس کے بعد کارٹر نے دعا کی: ''خدایا مصریوں کو اور اسرائیل کو پر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ بے جن نے کہا ''آمین''۔ اس کے بعد جمی کارٹر نے دعا کی کہ: ''خدایا اسرائیلیوں کو بتادے کہ وہ عربوں کو وہ تمام علاقے واپس کردیں جن پر انہوں نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا ہے۔ یہ سن کر بے جن نے کہا: ''جناب صدر، میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ ایک دیوار کو خطاب کر رہے ہیں''۔

When former US President Carter visited Jerusalem, Israel's Prime Minister Begin took him to the Wailing Wall. "Oh God, Carter prayed, "please help the Arabs and Israelis to find peace."
"Amen", said Begin.
"And please, God, let the Egyptians and Israelis live in peaceful co-existence".
"Amen", said Begin.
"And please, tell the Israelis to return to the Arabs all the territories they occupied in the 1967 war".
"I would like to remind you, Mr. President," said Begin, "that you are talking to a wall".

(Reader's Digest, May 1981)

یہ صرف اسرائیلی وزیراعظم کا لطیفہ نہیں ہے، یہی موجودہ زمانہ کے تمام انسانوں کی تصویر ہے۔ لوگ انصاف کی باتیں کرتے ہیں مگر اس سے مراد صرف وہ انصاف ہوتا ہے جس کا فائدہ ان کی اپنی ذات کو مل رہا ہو، جو انصاف ان کی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ دے اس سے لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ دعاؤں پر آمین کہتے ہیں مگر ان کی آمین صرف اس دعا کے لئے ہوتی ہے جس کی زد دوسروں پر پڑ رہی ہو، جس دعا کی زد خود ان کے اپنے اوپر پڑے اس دعا کے اوپر کوئی آمین کہنے والا نہیں۔ لوگ حق پرستی کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی حق پرستی کا مطلب دوسروں پر اپنے حقوق ثابت کرنا ہے، جو حق انہیں ان کی اپنی ذمہ داریاں یاد دلائے اس حق کا آج کی دنیا میں کوئی خریدار نہیں۔

ہر حال میں خدا سے پناہ مانگنا

عمرو بن محبوب الکنانی (۲۵۵-۱۶۳ھ) بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ وہ عام طور پر الجاحظ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا شمار ادب کے ائمہ میں ہوتا ہے۔ مطالعہ کے اتنے زیادہ حریص تھے کہ آخر عمر میں جب مفلوج ہو کر مرے تو ان کے سینہ پر کتاب رکھی ہوئی تھی۔ ان کی ایک کتاب ''البیان والتبیین'' ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے یہ دعا لکھی ہے:

اللھم انا نعوذ بک من فتنة القول کما نعوذبک من فتنة العمل. ونعوذبک من التکلف لمالانحسن کما نعوذبک من العجب بما نحسن. ونعوذبک من السلاطة والهذر کما نعوذبک من العی والحصر.

اے اللہ! ہم تجھ سے قول کے فتنہ سے اسی طرح پناہ مانگتے ہیں جس طرح ہم تجھ سے عمل کے فتنہ سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے اس کام کا بار اٹھانے سے پناہ مانگتے ہیں جس کو ہم بخوبی نہیں کر سکتے اور اسی طرح اس کام پر گھمنڈ سے پناہ مانگتے ہیں جس کو ہم بخوبی کر سکتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے زبان درازی اور لغوبات سے پناہ مانگتے ہیں جس طرح ہم تجھ سے کلام پر قادر نہ ہونے اور گفتگو میں عاجز ہو جانے سے پناہ مانگتے ہیں۔

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ کوئی نہ کوئی آزمائش کا پہلو لگا ہوا ہے۔ اس لئے وہ شخص خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو اس کو ہر معاملہ میں خدا سے پناہ مانگنا چاہئے اور ہر معاملہ میں خدا کی مدد کا طالب ہونا چاہئے۔

اس دنیا کی اصل امتحان یہ نہیں کہ آدمی نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ یہاں اصل امتحان یہ ہے کہ کھونے یا پانے کے موقع پر اس نے کیا ردعمل (response) پیش کیا۔ اس کو قول کے معاملہ میں بھی اتنا ہی محتاط ہونا چاہئے جتنا کوئی شخص عمل کے معاملہ میں محتاط ہوتا ہے۔ اس کو اپنے کئے کو بھی اسی خانہ میں ڈالنا چاہئے جس خانہ میں وہ اپنے نہ کئے کو ڈالتا ہے۔ اس کو قدرت کے موقع پر بھی اسی طرح عبدیت کا ثبوت دینا چاہئے جس طرح عجز کے موقع پر عبدیت کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی بھی آزمائش ہے اور ناکامی بھی آزمائش۔ یہاں عمل بھی جانچ کا لمحہ ہے اور بے عمل بھی جانچ کا لمحہ۔

مثبت دعا

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں یکساں حالات کا برقرار رہنا ممکن نہیں۔ یہاں عین فطرت کے قانون اور عین تخلیقی نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ بار بار حالات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ بار بار نقصان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، یہ نقصان کبھی خوف کی صورت میں پیش آئے گا، کبھی بھوک کی صورت میں، اور کبھی مال اور جان اور فائدہ میں کمی کی صورت میں (البقرہ ۱۵۵)۔

ایسی حالت میں ایک انسان وہ ہے جو فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ وہ شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر یہ سچے انسانوں کا طریقہ نہیں۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

ایسے مواقع پر کسی انسان کے لئے صحیح اور سچا طریقہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ سارے معاملہ کو مالکِ کائنات پر ڈال دے۔ وہ مصیبت کو صبر کا معاملہ بنائے نہ کہ بے صبری کا۔ وہ اس کو وقتی تاثر کے خانہ میں ڈالے نہ کہ مستقل تاثر کے خانہ میں۔

جن لوگوں کے اندر یہ ربانی شخصیت ہو، جو سچائی کے راستہ کو پائے ہوئے ہوں۔ ان پر جب ایسی کوئی آفت آتی ہے کو ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ خدایا، تو ہماری مصیبت میں ہم کو اجر دے۔ تو اس کے بعد ہمارے لئے خیر کی صورت پیدا فرما دے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون. اللھم اجرنا فی مصیبتنا و اخلف لنا خیر امنھا)

جو بندہ شخصی یا قومی مصیبت پیش آنے کے بعد یہ کہہ پڑے۔ اس کو فوراً ایک نیا سنبھالا مل جائے گا۔ جھٹکا لگنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ ناامیدی کے تجربہ سے دوچار ہونے کے بعد وہ جلد ہی امید کا نیا تحفہ اپنے لئے پالے گا۔

ایسے لوگ ماضی کو کھو کر دوبارہ اپنے مستقبل کو پالیتے ہیں، وہ محرومی میں بھی یافت کا سرمایہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں بظاہر کہانی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہو وہاں بھی وہ ایک نیا پیراگراف معلوم کر لیتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کی کہانی کو از سر نو شروع کر سکیں۔

غم کو دعا میں ڈھالنا

قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ان کے سوتیلے بھائیوں کے غلط سلوک کی وجہ سے وہ وقت آیا جب کہ حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب بظاہر اپنے عزیز بیٹوں سے محروم ہو گئے۔ اس حادثہ کے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے یہ دعائیہ کلمہ نکلا: انما أشکو ابثی و حزنی الی اللہ (یوسف ۸۶) یعنی میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

پیغمبر کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ایک اہم حقیقت کو بتاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن جب کسی غم سے دوچار ہوتا ہے تو وہ عام انسان کی طرح آہ اور فریاد میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایمانی شعور اس کے غم کو دعا میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف رجوع ہوا اس سے التجا کرنے لگتا ہے کہ وہ اس کے کھونے کو یافت میں بدل دے، وہ اس کی محرومی کی حسن تلافی فرمائے۔

کسی انسان کے ساتھ جب غم اور محرومی کا تجربہ پیش آتا ہے تو اس وقت اس کے لئے ردعمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہے، انسانوں کی طرف دیکھنا، اور دوسرا ہے، خدا کی طرف دیکھنا۔ جو لوگ حادثہ کے وقت انسان کی طرف دیکھیں وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ انسان کے خلاف فریاد و فغاں میں مبتلا ہو جائیں۔ مگر جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اس قسم کے تجربہ کے بعد خدا کو یاد کرنے لگے، وہ چھیننے والے کے بجائے دینے والے کو اپنا مرکز توجہ بنالے گا۔ اس کا ذہن مایوسی کے بجائے امید کا آشیانہ بن جائے گا۔

دعا ایک طاقت ہے۔ نازک وقتوں میں دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا اس اعتماد کا سرچشمہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی کھونا آخری نہیں، بلکہ ہر کھونے میں از سر نو پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

ہر آدمی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ ایسے لمحات میں خدا سے دعا کرنا آدمی کے دل کو سکون بخشتا ہے۔ دعا گویا کسی آدمی کے لئے کرائسس منیجمنٹ (crisis management) کا بہترین ذریعہ ہے۔

بارش شروع ہوگئی

چوتھی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اندس میں سلطان عبدالرحمٰن الناصر کی حکومت تھی۔ اس کا دار السلطنت قرطبہ تھا۔ قاضی منذر بن سعید اس وقت قرطبہ کے قاضی تھے اور اسی کے ساتھ وہ قرطبہ کی جامع مسجد میں نماز کی امامت کی خدمت بھی انجام دے رہے تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے عالم بھی۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزہرا کے نام سے ایک شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کئے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب وہ جامع مسجد آیا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر نے جو خطبہ دیا اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی۔ قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہوجانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً: کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (شعراء) تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ انکے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے (توبہ) اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔ اپنے خطبہ میں اگرچہ انہوں نے سلطان کا نام نہیں لیا مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقیدیں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمع عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر تھی۔ اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہوجاتے ہیں۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگرچہ سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کرلیا ہے کہ ان کے پیچھے جمعہ کی نماز کبھی نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کردیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کردیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمہارا برا ہو ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کردیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی (ھذا مالایکون) مجھے ان باتوں سے چوٹ لگی اسلئے میں نے انکے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھالی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے۔ (بل یصلی بالناس حیاتنا وحیاتہ انشاء اللہ تعالیٰ) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اس کے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہوگئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقاء کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھٰذہ ناصیتی بیدک، اتراک تعذب بی الرعیۃ وانت ارحم الراحمین)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہوگیا۔ انہوں نے قاصد سے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہوگی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہوکر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔

صحت فکر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: اللھم ارنا الحق حقا وارقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً و ارزقنا اجتنا بہ ؤ ارنا الاشیاء کما ھی (اے اللہ حق کو ہمیں حق کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس کی پیروی کی توفیق دے۔ اور باطل کو ہمیں باطل کی صورت میں دکھا اور ہمیں اس سے بچنے کی توفیق دے اور چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)

یہ گویا صحت فکر کی دعا ہے۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر چیز پر التباس کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ کوئی بات جب آدمی کے سامنے آتی ہے تو ہمیشہ اس کا خطرہ رہتا ہے کہ وہ اس کو غلط رخ سے لے لے۔ اور پھر اس غلط تاویل کے لئے اس کو خوبصورت الفاظ بھی مل جائیں۔ اس فتنہ سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ آدمی رائے قائم کرنے میں بے حد محتاط ہو۔ نیز اس معاملہ میں وہ مذکورہ دعا سے برابر مدد لیتا رہے۔

مثلاً آپ توحید خالص کا نظریہ پیش کریں گے اور سننے والا فوراً انسانی بادشاہوں کی مثال دے کر کہنے لگے گا کہ ٹھیک ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، مگر بادشاہوں تک پہنچنے کے لئے درمیانی وسائل ہوتے ہیں۔ اسی طرح خدا تک پہنچنے کے بھی درمیانی وسائل ہیں۔ آپ ایک شخص کے سامنے قرآن کی آیت پیش کر کے کہیں گے کہ دشمن سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ، اسکے بعد تم دیکھو گے کہ دشمن بھی تمہارا گہرا دوست بن گیا ہے۔ وہ شخص کہے گا کہ یہ تو تم بے غیرتی کی بات کر رہے ہو۔ ہمیں تو دشمن کو سبق سکھانا ہے، اسکے بغیر وہ اپنی مخالفانہ کارروائی سے باز نہیں آسکتا۔ آپ قرآن وحدیث کا حوالہ دے کر کہیں گے کہ اس دنیا میں کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور آپ کا مخاطب اس کی تردید میں یہ الفاظ پالے گا کہ یہ تو بزدلی کی تعلیم ہے۔ اسلام کا طریقہ اقدام کا طریقہ ہے، اسلام کا طریقہ پسپائی کا طریقہ نہیں۔

چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھنا اور معاملات میں صحیح رائے قائم کرنا، خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کے مالک وہی لوگ بنتے ہیں جو غلط تاویلات کے فتنہ سے اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔

دعا اور روزہ

روزہ کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں دعا کا ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزہ اور دعا میں خاص تعلق ہے۔ روزہ آدمی کو مؤثر انداز میں دعا کرنے والا بناتا ہے:

واذاسئالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوالی ولیؤمنوابیلعلھم یرشدون (البقرہ ۱۸۶)

اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ وہ ہدایت پائیں۔

روزہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے صبر کا عمل ہے۔ صبر کیا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی حکم الٰہی کی تعمیل میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرے۔ وہ برداشت کی قیمت پر اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بنے۔

یہ صبر و برداشت ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی اس قلبی حالت کو پہنچتا ہے جو اس کو خدا سے قرب کا تجربہ کرائے۔ اس کے بعد ہی آدمی کی زبان سے وہ پر اثر کلمات نکلتے ہیں جو خدا کے یہاں قبولیت کے مستحق ٹھہریں۔ صبر ہی وہ زمین ہے جس سے دعا کا مبارک پودا اگتا ہے۔

اس دنیا میں وہی شخص اللہ کو پاتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرے، اور اللہ تک اسی شخص کے الفاظ پہنچتے ہیں جس نے اپنی روح کے تاروں کو اللہ سے ملا رکھا ہو۔ اللہ سے قربت کثیف روحوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ یہ خوش نصیبی صرف اس شخص کے لئے مقدر ہے جو اپنے اندر لطیف روح کا سرمایہ رکھتا ہو۔

دعا صرف ایک لفظی عمل نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک قلبی عمل ہے۔ قلب کے اندر جتنی زیادہ صلاحیت ابھرے گی اتنا ہی زیادہ اثر انگیز دعا آدمی کی زبان سے نکلے گی۔ اسی سے روزہ اور دعا کا ربط معلوم ہوتا ہے۔ روزہ آدمی کے قلب کی استعداد کو بڑھاتا ہے اور جب قلب کی استعداد بڑھتی ہے تو اس سے جو دعا نکلتی ہے وہ بھی عام دعاؤں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

حقیقی روزہ وہ ہے جو حقیقی دعا میں ڈھل جائے۔ جو روزہ داری کے احساسات کو آدمی کی دعا میں شامل کر دے۔

دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے
نہ کہ محض زبانی الفاظ سے

حضرت مسیح نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا: مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ گے تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے۔ اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں ایسا کون آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اس کو پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اس کو سانپ دے۔ پس جب کہ تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔ (متی: ۷۔۱۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگتا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ مانگنا وہی مانگنا ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہوئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو ''خدایا مجھے اپنا بنالے'' مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے، تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں۔ اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے، وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی۔ خواہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کئے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اسکے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کردے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور خدا آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دین داری مانگیں اور خدا آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے

دے۔آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی کوٹھری میں بند کر دے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔وہ کہے کہ خدایا' میں نیتجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔بخدا' یہ ناممکن ہے۔یہ ناممکن ہے۔یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آ کر آواز دیتا ہے ..... ''کون ہے جو مجھ سے مانگے تا کہ میں اسے دوں'' مگر جنہیں لینا ہے وہ اس سے غافل اور اندھے بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

God calls to the Home of Peace (10:25)

AL-FALAH

PEACE&SPIRITUALITYCENTRE
COUNSELLING&LIBRARY

002, HM Wimberly, #6, Berlie Street Cross,
Langford Town, Bangalore - 560 025
Tel: 080-65904690 Mobile: 9880310382
E-mail: al-falah@live.com

پتھر کھسک گیا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیان کیا۔ سننے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے تین آدمی ایک سفر پر نکلے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تو رات گزارنے کے لئے وہ ایک غار میں داخل ہوگئے۔ پہاڑوں پر اکثر پتھر گرنے (land slide) کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھک کر گرا اور اس کی وجہ سے غار کا منہ بند ہوگیا۔ انہوں نے کہا کہ اس چٹان سے نجات کی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم اپنے نیک عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔

اب ایک شخص دعا کرنے بیٹھا۔ اس نے کہا: خدایا' میرے ماں باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ شام کو جب میں اپنے جانور چرا کر لوٹتا تو جب تک میں ان دونوں کو دودھ نہ پلا لیتا نہ خود دودھ پیتا اور نہ کسی اور کو پلاتا۔ ایک دن میں چارہ کی تلاش میں دور نکل گیا۔ شام کو واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ میرے ماں باپ سو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لئے دودھ نکال کر تیار کیا۔ جب ان کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو دونوں کو سوتا ہوا پایا۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ ان کو جگاؤں اور مجھ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان سے پہلے دودھ پیوں اور اپنے بچوں کو پلاؤں۔ میں ان کے پاس کھڑا ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ جب وہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پیش کروں۔ اسی حال میں صبح ہوگئی۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلاتے رہے۔ صبح کو وہ دونوں اٹھے اور انہوں نے دودھ

پیا۔اس کے بعد ہم سب لوگوں نے دودھ پیا۔میرے اللہ یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس چٹان کی مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔چنانچہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ تینوں نکل سکیں۔

اب دوسرے آدمی نے دعا شروع کی۔اس نے کہا: خدایا' میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔وہ مجھ کو بہت محبوب تھی' اس سے مجھ کو اسی قسم کی شدید محبت تھی جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔میں نے اس سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنی چاہی مگر وہ منع کرتی رہی۔کچھ عرصہ بعد وہ قحط سالی کی مصیبت میں پریشان ہوئی۔وہ مدد کے لئے میرے پاس آئی۔میں نے اس کو ۱۲۰ دینار اس شرط پر دئے کہ وہ مجھ کو اپنے اوپر قابو دیدے۔وہ اس کے لئے تیار ہوگئی۔یہاں تک کہ جب میں اس کے اوپر پوری طرح قادر ہوگیا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے کہا: خدا سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر نہ توڑ۔میں اس سے باز آ گیا حالاں کہ وہ مجھ کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھی۔اور جو دینار میں نے اس کو دئے تھے وہ بھی اس سے واپس نہیں لئے۔خدایا' اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے جس میں ہم اس وقت پھنسے ہوئے ہیں۔چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی مگر اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

اب تیسرے آدمی نے دعا کی۔اس نے کہا۔خدایا' میں نے کچھ مزدور اجرت پر رکھے۔کام کے بعد میں نے سب کو اجرت دیدی۔مگر ایک مزدور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔میں نے اس کی چھوڑی ہوئی رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔اس سے مجھ کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوا۔کچھ عرصہ بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے' میری اجرت مجھ کو دیدے۔میں نے اس سے کہا: یہ اونٹ' یہ گائیں' یہ بکریاں اور یہ غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمہاری مزدوری ہے۔اس نے کہا: اے خدا کے بندے' مجھ سے مذاق نہ کر۔میں نے کہا کہ میں تم سے مذاق

نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سب تمہارا ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے سب چیزیں لیں اور ان کو اس طرح ہنکا لے گیا کہ ان میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ خدایا! اگر یہ میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دیدے۔ اس کے بعد چٹان ہٹ گئی اور تینوں باہر نکل کر روانہ ہو گئے (بخاری و مسلم)

یہ روایت صحیحین میں آئی ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کہ دعا ایسی چیز ہے جو پتھر کی چٹان کو بھی اپنی جگہ سے کھسکا دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دعا نہیں ہے جو زبان سے بس الفاظ کی صورت میں نکلتی ہے اور آدمی کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ دعا سے چٹان کھسکنے کا واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے تابع کر دیں، جو اپنے اوپر خدا کو نگراں بنالیں۔ حتیٰ کہ بھوک کی شدت اور بیوی بچوں کی محبت بھی ان کو خدا کی پسندیدہ راہ سے نہ ہٹا سکے۔ انتہائی نازک جذباتی مواقع پر بھی خدا کی یاد دلانا ان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہو، ہیجان خیز لمحات میں بھی جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، اور ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی حرکت بند کر دیں۔ آخرت کے حساب کا اندیشہ ان پر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ایک حق دار کا حق ادا کرنے کی خاطر اگر ان کو اپنا سارا اثاثہ دے دینا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہ کریں۔ ایک آدمی اگر اپنا مطالبہ لے کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ مطالبہ کرنے والا کتنا ہی بے زور ہو اور اس کے مقابلہ میں ان کو کتنی ہی زیادہ قوت حاصل ہو۔

خدا کے بندے وہ ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے اور اپنے فائدوں کو ذبح کرنے کی قیمت پر خدا کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح خدا کو اپنا لیں وہ اگر کہیں کہ خدایا تو اس پتھر کی چٹان کو کھسکا دے تو خدا پتھر کی چٹان کو بھی ان کے لئے کھسکا دیتا ہے۔

بددعا نہیں

لیس لک من الامر شئی اویتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون. وللہ می فی السماوات و ما فی الارض یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء وللہ غفور رحیم (آل عمران ۱۲۹۔۱۲۸)

ترجمہ: تم کو کچھ اختیار نہیں۔ اللہ یا ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے' کیوں کہ وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے' اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

احادیث سے ثابت ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کافروں اور مشرکوں پر لعنت کی اور ان کے خلاف بددعا کی۔ اس پر یہ آیتیں اتریں۔ اس آیت میں ان کافروں اور مشرکوں کو صاف طور پر ''ظالم'' کہا گیا ہے۔ مگر ظالم ہونے کے باوجود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ آپ ان پر لعنت بھیجیں اور ان کے خلاف بددعا فرمائیں۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت مختلف روایتیں جمع کی ہیں۔ انکے مطالعہ سے آیت کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم کچھ روایتوں کو مختصر طور پر نقل کرتے ہیں۔

امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کی دوسری رکعت میں جب رکوع سے سر اٹھاتے تو سمع اللہ لم حمدہ کہنے کے بعد یہ کہتے: اللھم العن فلاناً و فلاناً (خدایا فلاں اور فلاں پر لعنت کر) اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی (اور لعنت سے منع کر دیا) امام احمد نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے تھے کہ اے اللہ' حارث بن ہشام' سہیل بن عمرو' صفوان بن امیہ پر لعنت کر' اس پر مذکورہ آیت اتری (اور آپ کو لعنت سے منع کر دیا گیا)

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین میں سے کچھ لوگوں کا نام لے کر ان کے خلاف بددعا کرتے تھے۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت اتاری (تو آپ نے بددعا چھوڑ دی)۔ امام بخاری نے ایک اور روایت میں نقل کیا ہے کہ غزوۂ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تو آپ نے کہا کہ وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو زخمی کرے۔ اس وقت مذکورہ آیت اتری۔

بادشاہ بھی

یروی ان عبد الملک بن مروان خطب یوماً خطبة بلیغة ثم قطعها وبکیٰ بکاءً شدیداً ثم قال: یا رب ان ذنوبی عظیمة و ان قلیل عفوک اعظم منها. اللهم فامح بقلیل عفوک عظیم ذنوبی. فبلغ ذالک الحسن فبکیٰ وقال لو کان کلام یکتب بالذهب لکتب هذالکلام (الدعوۃ ۱۲ جمادی الآخرۃ ۱۴۰۵ھ)

بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک روز ایک بلیغ خطبہ دیا۔ پھر وہ رک گیا۔ اور شدت کے ساتھ رویا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اے میرے رب، بے شک میرا گناہ بہت زیادہ ہے مگر تیری تھوڑی معافی اس سے بھی زیادہ ہے۔ اے اللہ! اپنی تھوڑی سی معافی سے میرے زیادہ گناہ کو مٹادے۔ یہ بات حضرت حسن بصری کو پہنچی تو اس کو سن کر وہ رو پڑے اور کہا کہ اگر کوئی کلام سونے سے لکھا جاتا تو یقیناً یہ کلام اس قابل تھا کہ اسے سونے سے لکھا جائے۔

عبدالملک بن مروان (۸۵۔۲۳ھ) بنو امیہ کا نہایت ذہین اور مدبر خلیفہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی اسی کا عامل تھا جس نے مکہ پر چڑھائی کی اور عبداللہ بن زبیر کو قتل کیا۔ عبدالملک بن مروان کا شمار تابعین کے گروہ میں ہوتا ہے۔

مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے جابر بادشاہ بھی خدا کے خوف سے خالی نہ تھے۔ کسی نہ کسی موڑ پر ان کا جذبہ پھٹ پڑتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ''دیندار'' لوگ بھی خوف خدا سے خالی ہو گئے ہیں۔ ان کی نمازوں نے ان کے دلوں کو نرم نہیں کیا۔ ان کے ذکر نے ان کے سینہ کو چھلنی نہیں کیا۔ ان کا ایمان وہ ایمان نہیں بنا جو ان کو خدا کے سامنے کھڑا کر دے۔

موجودہ زمانہ کے لوگوں پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (البقرۃ ۷۴)

جب مادی حالات کے اندر بھی روحانی دعائیں نکلنے لگیں

حضرت موسیٰؑ پر قتل کا الزام عائد کر کے جب مصری سرداروں نے مشورہ کیا کہ انہیں ہلاک کر دیں، تو آنجناب مصر سے مدین چلے گئے۔ مدین اس زمانہ میں، خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع علاقہ کو کہا جاتا تھا جہاں بنی مدیان آباد تھے۔ یہ مقام فرعونِ مصر کی سلطنت سے باہر تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ جب آپ خوف اور اندیشہ کی حالت میں سفر کر رہے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا: عَسیٰ رَبِّی اَنْ یَّھْدِیَنِی سَوَاءِ السَّبِیْل (قصص۔۲۲)

امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا۔

بعض مفسرین قرآن نے اس کو محض راستہ کی تلاش کے معنی میں لیا ہے۔ ایک مفسر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں''

یہ الفاظ اس کیفیت کی ترجمانی کے لئے بہت ناقص ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں پیدا ہوئی تھی، یہ ایک مومنانہ کلمہ ہے نہ کہ عام معنوں میں محض ایک راستہ کے مسافر کی دعا۔ حضرت موسیٰؑ کو اگرچہ مادی حالات نے مصر سے نکال کر مدین کے راستہ پر ڈالا تھا، مگر بندہ مومن کا یہ حال ہوتا ہے کہ مادی واقعات کے اندر بھی اس کی زبان سے روحانی دعائیں نکلتی ہیں۔ بظاہر وہ اسی زمین میں راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے مگر زمین میں راستہ کی تلاش اس کے لئے دوسری دنیا کی یاد دہانی بن جاتی ہے، وہ اس کے ذہن کو آخرت کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے قدم دنیوی منزل کی طرف چل رہے ہوتے ہیں، مگر اس کے اندر کا طوفان پکار رہا ہوتا ہے..... ''خدایا! مجھے وہاں پہنچا دے جہاں میں تجھ کو پا سکوں۔ کیوں کہ انسان کی حقیقی منزل وہی ہے۔''

حضرت موسیٰؑ کا یہ کلمہ ایک نازک ایمانی کیفیت کا کلمہ ہے۔ اس کو سفر اور جغرافیہ کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ حقیقی معنوں میں اپنے رب کو پالیں، ان کے جینے کی سطح بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ آج کی لذتوں اور تلخیوں کو دیکھتے ہوئے کل کے جنت اور جہنم کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالتِ غیب میں رہتے ہوئے حالتِ شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہی دن آئے گا جب کہ وہ عالم آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ غیب و شہود کا فرق مٹ چکا ہوگا۔ جب قیامت کی چنگھاڑ سارے پردوں کو پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان و یقین کا ثبوت دینے کا۔

بددعا سے بچنا اور ہمیشہ اچھی دعا کرنا

رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے اپنے حق میں دعا کیلئے کہتا تو آپ فوراً انہیں الفاظ میں اس کیلئے دعائیہ کلمات کہتے جن الفاظ میں اس نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنی مشرک ماں کیلئے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا: اے خدا کے رسول! اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (ادع اللہ ان یھدی ام ابی ھریرۃ) آپ نے فوراً دعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ! ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (اللھم اھدا ام ابی ھریرۃ) نیز حسب موقع اس میں کچھ بہتر الفاظ کے ساتھ اضافہ فرمادیتے۔ ایک بار حضرت ابو ہریرہ نے آپ سے کہا کہ اے خدا کے رسول میرے لئے خدا سے دعا کردیجئے کہ وہ مجھ کو اور میری ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنادے (ادع اللہ ان یحببنی و امی الی عبادہ المومنین) آپ نے فرمایا: اے اللہ ابو ہریرہ اور ان کی ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنادے اور اپنے مومن بندوں کو ان دونوں کے لئے محبوب کردے (اللھم حبب عبیدک ھذا و امہ الی عبادک المومنین و حببھم الیھا)۔

یہ طریقہ آپ کا اچھی دعا کیلئے تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص بددعا کیلئے کہتا تو اس صورت میں آپ کا طریقہ دوسرا ہوتا۔ اب آپ آدمی کی درخواست کے برعکس اسکے لئے بہتری کی دعا کرنے لگتے۔ طفیل بن عمرو الدوسی مکہ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اسکے بعد اپنے وطن واپس جاکر قبیل دوس میں تبلیغ کرنے لگے۔ مگر ان کی بیوی کے والد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول! قبیلہ دوس کیلئے بددعا فرمایئے۔ آپ نے حضرت طفیل سے کوئی بحث نہ کی بلکہ ان الفاظ میں دعا کرنا شروع کردیا: اے اللہ قبیلہ دوس کے لوگوں کو ہدایت دے (اللھم اھد دوسا) اس کے بعد حضرت طفیل نے دوبارہ اپنے قبیلہ میں واپس آکر تبلیغ کی تو سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ انہیں میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ بھی تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ واقعات میں جو طریقہ ملتا ہے یہی مومن کا اصل مزاج ہے۔ مومن کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہوتی ہے۔ اسلئے وہ بھی ایک مومن کیلئے وہی بہتر چیز چاہنے لگتا ہے جس کا وہ مومن خود خواہاں ہو۔ مومن دوسرے کی ہدایت کا حریص ہوتا ہے، اسلئے جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص صحیح راستہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ اس کے خلاف بددعا نہیں کرتا۔ بلکہ اسکے حق میں خدا سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کا سینہ ہدایت کیلئے کھول دے۔

اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: ولله الاسماء الحسنیٰ (الاعراف:180) یعنی اللہ ہی کے لئے ہیں اچھے نام (best names) ۔ یہ بات قرآن میں چار مقامات پر کہی گئی ہیں۔ (الاعراف: 180 ; الاسراء: 110 ; طٰہٰ: 8 ; الحشر :24) یہاں نام سے مراد نام نہیں ہیں، بلکہ صفات (attributes) ہیں، یعنی تمام اچھی صفتیں خدا ہی کے لئے ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ کی تعداد کیا ہے، ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننانوے ہے۔ بعض علماء اسماءِ حسنیٰ کی تعداد میں اضافہ کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ایک ہزار تک ہے (تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 269)۔ مگر اس معاملے میں تعداد کی حیثیت اضافی ہے۔ یہ تعداد دراصل، انسانی فرہنگ یا مجموعۂ الفاظ (vocabulary) کے اعتبار سے ہے۔ انسانی زبان کے الفاظ محدود ہوتے ہیں، لیکن خدا ایک لامحدود ہستی ہے، اس لئے خدا کی صفات بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے لامحدود ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کی ننانوے تعداد گویا کہ خدا کی نمائندہ صفات ہیں۔ اس اعتبار سے خدا کی بقیہ صفات بھی براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انہیں بنیادی صفات میں شامل ہیں۔

خدا کے ننانوے نام

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ان لله تسعة و تسعين اسماً، مأة الا واحداً ۔ من احصاها دخل الجنة (صحيح البخاری، باب لله مأة اسم غير واحدة، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء) یعنی حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ننانوے نام ہیں، سو

میں سے ایک کم۔ جس شخص نے ان کا احصا کیا' وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اس حدیثِ رسول میں 'احصاء' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ احصا کا مطلب مجرد شمار کرنا نہیں ہے' بلکہ اس سے مراد اسماءِ حسنیٰ کا عارفانہ ادراک ہے۔ عربی کے مشہور لغت 'المعجم الوسیط' میں اس کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: احصی الشئی : أی عرف قدرہ۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہاں 'احصاء' سے مراد احصاء شعوری ہے' نہ کہ احصاء لسانی' یعنی اسماءِ حسنیٰ کی معرفت۔

اللہ کے یہ نام دراصل اللہ کی صفات کے مختلف پہلو ہیں۔ آدمی خدا پر اور اس کی تخلیقات پر غور کرتا ہے تو خدا کی خدائی کے مختلف پہلو اسکے سامنے آتے ہیں۔ انہیں پہلوؤں کا شعوری ادراک ہونا' ان کا احصاء کرنا ہے۔ اور جو لوگ اس اعتبار سے خدا کی معرفت حاصل کریں' وہ بلاشبہہ جنت میں جائیں گے' کیونکہ جنت دراصل معرفتِ خداوندی کی قیمت ہے۔

حدیث میں ننانوے کا لفظ محض اعتباری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ: ان للہ خمسۃ الاف اسم۔ یعنی اللہ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر' جلد 1' صفحہ 19)' مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔

حدیث میں اسماءِ حسنیٰ کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ قرآن کا مطالعہ کر کے علماء نے یہ تمام اسماءِ حسنیٰ نام بہ نام دریافت کئے ہیں' لیکن یہ نام خدا کے لامتناہی کمالات کی مطلق گنتی کو نہیں بتاتے۔ یہ تمام نام دراصل انسان کی نسبت سے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر جب عبدیت جاگتی ہے اور شعورِ خداوندی اس کے اندر بیدار ہوتا ہے تو فطری طور پر اس کے اندر مختلف قسم کی ربانی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل' انہیں ربانی کیفیات کے لئے موزوں الفاظ (appropriate words) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مثلاً انسان اپنے وجود پر غور کرتا ہے، جو کہ احسنِ تقویم کا نمونہ ہے (التین:4)۔ وہ نیچر پر غور کرتا ہے، جس میں ہر چیز حیرت انگیز طور پر اپنے آخری ماڈل پر ہے۔ وہ زمین اور آسمان پر غور کرتا ہے، جس میں کہیں کوئی خلل یا نقص موجود نہیں (الملک:3)۔ یہ سوچ اور یہ مشاہدہ آدمی کے اندر ایک پر تموّج تجربہ (thrilling experience) پیدا کرتا ہے۔ اس وقت آدمی بے اختیارانہ طور پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کے پاس ایسے موزوں الفاظ ہوں، جن کے ذریعے وہ ان لطیف احساسات کا اظہار (express) کر سکے۔ اس وقت، قرآن اس کی عین طلب کے مطابق، اس کو یہ الفاظ فراہم کر دیتا ہے: فتبارک اللہ احسن الخالقین (المومنون:14)

خدا کے نام میں الحاد

خدائی صفات کی یہ تعداد دراصل 'الحاد' کے مقابلے میں بتائی گئی ہے، جیسا کہ خود قرآن میں آیا ہے (الاعراف 180)۔ الحاد کے معنی انحراف (deviation) کے ہیں۔ یہ الحاد یا انحراف سب سے زیادہ فلسفے میں کیا گیا ہے۔ فلسفے میں خدا کا تصور ایک بے صفاتی شخصیت (attributeless being) کے طور پر کیا گیا ہے۔ اسی فلسفیانہ تصور کے زیر اثر، ہندوازم میں 'نراکار خدا' (formless being) کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ مشہور جرمن فلسفی فریڈرک ہیگل (Friedrigh Hegel) نے اس کو روحِ عالم (world spirit) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک اور فلسفی نے اس کو 'مجرد تصور' (abstract idea) قرار دیا ہے۔

یہ فلسفیانہ تصور، بعض بڑے مذاہب کی اعتقادیات میں بھی داخل ہو گیا۔ اس تصور کے مطابق، خدا کی کوئی مستقل اور علاحدہ شخصیت نہیں۔ وہ ایک بے شخصیت اور بے صفات ہستی ہے، یعنی زمین کی قوتِ کشش (gravity) یا کاسمک ریز (cosmic rays) کی طرح۔ قرآن میں اسماءِ حسنیٰ کا بیان دراصل اسی فلسفیانہ گم راہی کی تردید کے طور پر آیا ہے، نہ کہ اسماءِ الٰہی کی متعین تعداد کو بتانے کے لئے۔

فلسفے میں یا اس سے متاثر مذاہب میں خدا کا تصور خالق کے طور پر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس تصور کے مطابق، تخلیق کے تمام مظاہر خود خدا کا اپنا ظہور ہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک مجرد فلسفیانہ قیاس ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ کائنات میں متنوع مظاہر پائے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ صرف ایک بے بنیاد قیاس ہے کہ ایک ایسا مفروضہ خدا، جو ہر قسم کی صفات سے کُلّی طور پر خالی ہو، وہ متنوع تخلیقات کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔ اس قسم کے تضادات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کا مذکورہ تصور محض ایک فلسفیانہ قیاس ہے، اس کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔

سائنسی مطالعہ

موجودہ زمانے میں فطرت کے سائنسی مطالعے کے بعد خدا کے متعلق یہ فلسفیانہ تصور عملاً بے اصل ثابت ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنسی مطالعے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ کائنات کے اندر کمال درجے میں معنویت (meaning) پائی جاتی ہے۔ اس قسم کی معنویت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس کا خالق ایک ذہن (mind) ہو۔ چنانچہ سائنس میں خدا کا نام نہ لیتے ہوئے یہ مان لیا گیا ہے کہ کائنات کو وجود میں لانے والا ایک ذہن نقاش (intelligent desinger) ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ماہ نامہ الرسالہ، ستمبر 2007، سائنس اور الٰہیات)۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک ایسے خدا کا تصور پیدائشی طور پر موجود ہے جو متنوع صفات کا حامل ہو۔ اس طرح سائنسی مطالعے میں کائنات اگرچہ آخری طور پر ایک ہی یونٹ (atom) کا مختلف ظہور ہے، لیکن یہ ایٹم حیرت انگیز طور پر مختلف اور متضاد قسم کی بامعنی چیزوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انسانی فطرت اور خارجی کائنات، دونوں اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کائنات میں ایک طرف بہت زیادہ اختلاف اور تنوع ہے اور دوسری طرف کائنات کے مختلف اجزا میں غیر معمولی ہم آہنگی (harmony) پائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں

انسان کا ذہن یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا کی متنوع حیثیتوں کا تصور کر سکے۔ قرآن میں مذکور اسماءِ حسنیٰ اسی سوال کا جواب ہیں۔

خدا کا فزیکل ماڈل

خدا کا عقیدہ انسان کے اندر ہمیشہ سے پایا گیا ہے۔ اینتھر اپالوجی (anthropology) کے تحت جو مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسانی سماج کسی نہ کسی اعتبار سے خدا کو مانتا رہا ہے۔ خدا کا عقیدہ فلسفیوں کے یہاں بھی پایا گیا ہے اور اہل مذاہب کے یہاں بھی۔ لیکن فلسفہ اور مذہب دونوں میں خدا کا عقیدہ ایک بے صفات خدا (attributeless God) کی حیثیت سے پایا جاتا رہا ہے، یعنی کاسمک ریز (cosmic rays) یا زمین کی قوتِ کشش (gravity) کی مانند۔

لیکن مجرد خدا (abstract God) انسان کی ذہنی گرفت میں نہیں آتا۔ انسان خدا کا ایک ایسا ماڈل بنانا چاہتا ہے، جس میں وہ خدا کو صفات کی اصطلاحوں (in term of attributes) میں قابلِ فہم بنا سکے۔ انسان کی یہی ضرورت ہے جس کے غیر فطری اظہار کے نتیجے میں بت وجود میں آئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ الفاظ یا ناموں کے ذریعے کسی حقیقت کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ اس طرح مختلف بُت، انسان کو مختلف الفاظ یا نام دے دیتے ہیں جن کے ذریعے وہ بزعمِ خود ایک ماڈل کے روپ میں خدا کا ادراک کرتا ہے۔ انسان نے اپنی اسی فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے غلط طور پر بت بنائے اور ان کی پرستش شروع کر دی۔

لیکن بتوں کی شکل میں خدا کا ماڈل بنانا، ایک بے بنیاد قیاس ہے، کیوں کہ خدا کو بتوں کا روپ دینا ایک لامحدود ہستی کو محدود کا روپ دینا ہے، یہ خدا کا ایک بگڑا ہوا فارم ہے۔ یہ خدا کے نام پر خدا کی نفی کے ہم معنی ہے۔

بت چوں کہ مٹی یا پتھر کے ہوتے ہیں اور انسان خود ان بتوں کو بناتا ہے۔ خدا کو بتوں کی

شکل دینے کے باوجود ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ صرف مٹی اور پتھر ہیں' ان کے اندر کوئی ذاتی طاقت نہیں۔ اس لئے بتوں کی سطح پر خدا پرستی عملاً صرف ایک بے روح رسم بن جاتی ہے۔ انسان کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ بتوں سے قلبی ربط قائم کر سکے۔ اس لئے فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ رسمی اعمال' خدا پرستی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ آدمی خدا پرستی کے نام پر کچھ بے روح رسموں' مثلاً پھول چڑھانے یا نذر و نیاز دینے کو خدا پرستی کے لئے کافی سمجھ لیتا ہے۔

مزید یہ کہ آدمی خدا کے نام پر بتوں سے قریب ہوتا ہے' لیکن بتوں کی طرف سے جوابی طور پر اس کو کوئی انسپریشن (inspiration) نہیں ملتا' انسان داخلی طور پر اپنے لئے کوئی روحانی غذا نہیں پاتا' اس لئے بتوں کا کلچر محض ایک بے روح تعلق بن کر رہ جاتا ہے۔ بتوں سے قربت کے باوجود انسان کو اتنی بھی روحانی کیفیت نہیں ملتی جتنا کہ ایک باپ یا ماں کو اپنے بچے سے مل کر حاصل ہوتی ہے۔

انسان ایک باروح شخصیت ہے۔ اپنی اس فطرت کے اعتبار سے اس کو ایک باروح خدا درکار ہے۔ پتھر کی مورتی سے اس قسم کا روحانی تعلق قائم ہونا ممکن نہیں۔ روحانی تعلق دو طرفہ تعلق کا نام ہے۔ ہمارے اندر کیفیات ہوں' لیکن دوسری طرف سے اس کا جواب نہ ملے تو اس قسم کا ایک طرفہ تعلق صرف اوپری یا غیر فطری تعلق ہوگا' وہ انسان کی زندگی میں کوئی حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

یہ واقعہ ایک اور شدید تر خرابی پیدا کرتا ہے' وہ یہ کہ بت کلچر آخر میں جھوٹ کلچر یا ظاہر داری کلچر بن کر رہ جاتا ہے۔ بتوں کے اندر خدائی اوصاف ثابت کرنے کے لئے فرضی کہانیاں بنائی جاتی ہیں اور ان کو خوب شہرت دی جاتی ہے' تاکہ بتوں کا جو فائدہ حقیقی طور پر نہیں ملا' ان کے بارے میں لوگوں کو یہ فرضی تاثر دیا جائے کہ وہ حاصل ہوئے' یا وہ حاصل ہو سکے۔

بت پرستی کا یہی ظاہرہ (phenomenon) قبر پرستی کی دنیا میں بھی نظر آتا ہے۔قبر پرست لوگ صاحب قبر کے نام پر انتہائی بے بنیاد قسم کے فرضی کہانیاں وضع کرتے ہیں۔وہ جھوٹے خوابوں کا طلسم بناتے ہیں اور پھر ان فرضی کہانیوں اور فرضی خوابوں کو اس طرح پھیلاتے ہیں جیسے کہ وہ سچ مچ واقعہ ہوں۔اس طرح اصنام کلچر اور درگاہ کلچر انسان کو دیوالیہ پن کی حد تک اعلیٰ اخلاق سے دور کر دیتا ہے۔

انسان عین اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے ایک جذباتی وجود ہے۔جذبات کا تفرق (diversification) ممکن نہیں۔انسان فطری طور پر اپنے جذبات کا کوئی ایک مرکز چاہتا ہے۔جذبات کا کئی مرکز ہونا ایک غیر فطری بات ہے جو عملاً ممکن نہیں۔بت پرستی اس معاملے میں بھی انسانی نفسیات سے ٹکرا جاتی ہے۔فطری طور پر انسان کسی ایک ہی چیز سے جذباتی تعلق قائم کر سکتا ہے۔بت پرستی کے مذہب میں چوں کہ یہ مراکز معتدد ہو جاتے ہیں' اس لئے اس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی خدا پرستی سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔خدا پرستی کے نام پر کچھ بے روح مظاہر باقی رہتے ہیں' اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ایک مثال

کسی ماں کا بچہ اپنی ماں سے دور ہو تو اس کی ماں ایسا نہیں کرے گی کہ وہ مٹی یا پتھر کے ذریعے اپنے بچے کی مورتی بنائے اور اس پر صبح و شام پھول چڑھائے' یا وہ اپنے بچے کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے اس کی کئی مورتیاں بنائے اور ان مورتیوں کے آگے وہ مختلف رسمیں ادا کرے۔اگر کوئی ماں ایسا کرے تو اس طرح اس کو اس کے جذبات کی تسکین نہیں ملے گی۔اپنے بچے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوگا۔اگر کوئی ماں ایسا کرے تو اس کے لئے اپنے بچے سے تعلق محض ایک ظاہر داری کی رسم بن جائے گی۔اس طرح کی ظاہر دارانہ رسوم کسی بھی درجے میں ماں اور بچے کے درمیان لطیف تعلق کا بدل نہیں بن سکتیں۔یہی وجہ

ہے کہ کبھی کسی ماں نے ایسا نہیں کیا۔ ماں اپنے دور کے بیٹے سے ہمیشہ تصوراتی تعلق قائم کرتی ہے، وہ اس کی مورتی بنا کر اس کے ذریعے اپنے بچے سے تعلق قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا کے نام پر خدا کے بت بنانا کتنا زیادہ بے اصل بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ خدا کے نام پر بتوں کی پوجا کرتے ہیں، یا جو لوگ خدا کے نام پر قبروں اور درگاہوں کے آگے جھکتے ہیں اور پھول اور چادر چڑھاتے ہیں، وہ خدا کے ساتھ حقیقی تعلق سے بالکل محروم ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ کچھ ظاہری رسوم میں جیتے رہتے ہیں، خدا کے ساتھ تعلق کی لطیف حقیقت سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوتے۔ خدا ان کے لئے محض ایک بے روح لفظ ہوتا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اسماءِ حسنیٰ: خدا کا تصوراتی ماڈل

اسماءِ حسنیٰ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں خدا کا تصور اپنے ذہن میں لائے وہ حقیقی طور پر خدا سے مربوط ہو سکے۔

بت پرستی کے مذہب میں انسان، خدا کے فزیکل ماڈل (physical model) بناتا ہے۔ اس قسم کے ماڈل بنانا ایک سنگین انحراف ہے، وہ خدا پرستانہ کلچر کو ایک بے روح رسم بنا کر رکھ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصنام کلچر یا درگاہ کلچر خدا کی خدائی کا کم تر اندازہ (underestimation) ہے۔ بت پرستی کے کلچر میں یا قبر پرستی کے کلچر میں اعلیٰ خدائی اخلاقیات کبھی پرورش نہیں پا سکتے۔

اسماءِ حسنیٰ گویا کہ اسی غلطی کی تصحیح ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان کو خدا کا تصوراتی ماڈل (conceptual model) مل جاتا ہے۔ اور بلا شبہہ خدا کا تصوراتی ماڈل ہی صحیح ماڈل ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کی شکل میں آدمی اُن صحیح الفاظ کو پا لیتا ہے جن کے ذریعے وہ خدا سے تصوراتی

ربط قائم کر سکے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے خدا سے جو تعلق قائم ہوتا ہے، وہ ایک زندہ اور معلوم تعلق ہوتا ہے۔

مثلاً انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ خدا ایک ہو اور وہ زندہ اور قائم خدا ہو۔ اب جب وہ کہتا ہے کہ: اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم (ال عمران:2) تو وہ عین اپنی فطری مانگ کے مطابق، فوراً خدا کا ایک حقیقی ماڈل پالیتا ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک زندہ تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسماءِ حسنیٰ، خدا اور انسان کے درمیان تصوراتی ربط (contact at conceptual level) کا زندہ اور حقیقی ذریعہ ہیں۔ وہ انسان کی فطری تلاش کا ایک بھرپور جواب (complete response) ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ، انسان کے لئے خدا کا مستند تعارف ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان خدا کی صفاتی شخصیت کا یقینی تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ خدا کا وہ تصوراتی ماڈل ہے جو کسی انسانی قیاس پر قائم نہیں ہے: بلکہ وہ خود خدا کے الہامی علم پر قائم ہے۔ وہ اعتقادی بے یقینی میں بھٹکے ہوئے انسان کو یقین کا سرچشمہ عطا کرتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے انسان اس صحیح فریم ورک کو پالیتا ہے جس کی روشنی میں وہ خدا کو اپنے لئے پوری طرح قابل فہم (understandable) بنا سکے۔

اسماءِ حسنیٰ اور دیگر مذاہب

اسماءِ حسنیٰ کا معاملہ تاریخی نقطہ نظر سے کیا جائے تو ایک انوکھی چیز دریافت ہوگی، وہ یہ کہ اسماءِ حسنیٰ کا تصور (concept) اسلام کے سوا کسی اور موجودہ مذہب یا کسی اور موجودہ اعتقادی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ یہ اسلام کی استثنائی صفت ہے کہ اس کے اندر خدا کے بارے میں اسماءِ حسنیٰ کا تصور پایا جاتا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اگر آپ اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کریں تو

معلوم ہوگا کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بے حد سنگین بات ہے۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام کے سوا، دوسرے مذاہب میں انسان اور خدا کے درمیان گہرا تعلق سرے سے نہیں پایا جاتا۔ ہر دوسرے مذہب میں خدا کی حیثیت صرف ایک علامتی ہستی (symbolic God) کی ہے، نہ کہ ایک حقیقی اور زندہ خدا کی۔

مثال کے طور پر یہودی مذہب کو لیجئے۔ یہودی اعتقادیات کا ماخذ بائبل (عہد نامہ قدیم) ہے۔ آپ اس کتاب کا مطالعہ کریں تو اس میں اسماءِ حسنیٰ کی نوعیت کا خداوندی تعارف موجود نہیں۔ ایک جگہ خدا کو بتاتے ہوئے، اس کے بارے میں ''میں جو ہوں، سو میں ہوں'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سلسلے میں بائبل کے اصل الفاظ اس طرح ہیں:

تب موسیٰ نے خدا سے کہا: جب میں بنی اسرائیل کے پاس جا کر ان کو کہوں کہ تمہارے باپ دادا کے خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور وہ مجھے کہے کہ اس کا نام کیا ہے تو میں ان کو کیا بتاؤں۔ خدا نے موسیٰ سے کہا: میں جو ہوں، سو میں ہوں۔ سو تو، بنی اسرائیل سے یوں کہنا کہ میں جو ہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ (خروج 3:13,14)

اسی طرح مسیحیت کا مذہبی ماخذ وہ کتاب ہے جس کو نیا عہد نامہ (بائبل) کہا جاتا ہے۔ اس نئے عہد نامے میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح جب صلیب پر چڑھائے گئے تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

الوہی، الوہی، لما شبقتنی، یعنی اے میرے خدا، اے میرے خدا، تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا:

My God, my God, why have you foresaken me. (Mark 15:34)

مسیحی چرچ کے عقیدے کے مطابق، حضرت مسیح کا سولی پر چڑھ کر مصلوب ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، وہ مسیحی چرچ کے عقیدے کے مطابق، ایک خدائی منصوبے کے تحت پیش آیا۔ کفّارہ مسیح کے عقیدہ (atonement) کے مطابق، خدا نے حضرت مسیح کو اسی خاص مقصد کے لئے دنیا میں بھیجا تھا کہ وہ انسانی گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے سولی پر چڑھ جائیں، اور

انہوں نے بخوشی ایسا کیا۔

مسیحی چرچ کے مبینہ عقیدے کے مطابق' خدا' تثلیث کا ایک حصہ ہے۔ مسیحی عقیدے کو ٹری نٹی (trinity) کے لفظ میں بیان کیا جاتا ہے' یعنی تین میں ایک اور ایک میں تین۔ اس عقیدے کے مطابق' حضرت مسیح عام انسان نہیں تھے' بلکہ وہ خدا کا ایک حصہ تھے۔

ایسی حالت میں حضرت مسیح کا مذکورہ واقعہ' انسان کے لئے خدا کے معاملے میں یقین کا سرچشمہ نہیں بن سکتا۔ اس واقعے میں خدا خود بے بس ہو کر فریاد کر رہا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو ایک متروک وجود سمجھتا ہے۔ اس کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے آپ کو وقت کے حکمرانوں سے محفوظ رکھ سکے۔ ایسا خدا' دوسرے انسانوں کے لئے کس طرح اعتماد کا سرچشمہ بن سکتا ہے۔ انسان کو ایک ایسا خدا چاہئے جو اس کے لئے اعتماد کا ذریعہ بن سکے' مگر مسیحیت' انسان کو ایک ایسے خدا کا تصور دیتی ہے جس میں خدا خود ہی بے بس دکھائی دے رہا ہے۔

اس کے بعد ان مذاہب کو لیجئے جن کو آرین مذاہب کہا جاتا ہے' یعنی ہندوازم' وغیرہ۔ ان مذاہب میں پرسنل گاڈ (personal God) کا تصور موجود نہیں۔ ان مذاہب میں اگرچہ خدا کا لفظ استعمال ہوتا ہے' مگر وہ صرف ایک علامتی لفظ ہوتا ہے' کیونکہ ان مذاہب میں عقیدۂ خدا کے تشخص کے لئے کسی مستقل وجود کا کوئی تصور نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے' آرین مذاہب میں خدا کو نراکار (formless God) مانا جاتا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق' خدا ''نرگن'' ہے' یعنی اس کی کوئی صفت نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا کو ایک متعین ہستی کے طور پر اپنے ذہن میں لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں خدا کی کوئی عبادت گاہ نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں یا بتوں کی پرستش ہوتی ہے یا گروؤں کی۔ کیونکہ بت یا گرو کا تشخص ان کو ممکن دکھائی دیتا ہے' لیکن خدا کا تشخص ان کے لئے قابل تصور نہیں ہوتا۔

عقیدۂ خدا اور اسماءِ حسنیٰ

خدا کا عقیدہ انسان کے لاشعور میں پیوست ہے۔ انسان اپنے فطری تقاضے کے تحت، اس لاشعور کو شعور میں لانا چاہتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کا تصور انسان کی اسی فطری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کی حیثیت ایک فکری ماڈل کی ہے۔ یہ انسان کے اپنے فریم ورک کے مطابق، خدا کی ہستی کو اس کے لئے قابل فہم بناتا ہے۔

مختلف مذاہب میں خدا کی ہستی کے مختلف ماڈل بتائے گئے ہیں۔ ان میں سے دو ماڈل زیادہ معروف ہیں۔ آکار ماڈل اور نراکار ماڈل، مگر یہ دونوں انسانی فریم ورم کے اعتبار سے انسان کے لئے قابل فہم ماڈل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ماڈل صرف کاغذ میں یا لفظوں میں پائے جاتے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں انسانی شعور کا حصہ نہ بن سکے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ماڈل انسان کی نسبت سے ناقص ماڈل ہیں۔ آکار ماڈل، دوسرے لفظوں میں بت کا ماڈل، ایک ایسے خدا کا تصور دیتا ہے جس کا بظاہر ایک فارم تو ہے، مگر وہ مکمل طور پر بے صفاتی (powerless) ہے۔ دوسری طرف 'نراکار ماڈل بظاہر ایک طاقت ہے، مگر یہ طاقت، کششِ ارض (gravity) کی طرح بے صفاتی (attributeless) ہے۔ اس طرح یہ دونوں ہی ماڈل، انسان کے معلوم فریم ورک کی نسبت سے مبہم ماڈل ہیں، وہ انسانی فطرت کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل اسی خلا کو پُر کرتے ہیں۔

اسماءِ حسنیٰ: تلاشِ فطرت کا جواب

اسماءِ حسنیٰ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے یہ تمام نام انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے سے ایک برتر ہستی کو چاہتا ہے۔ نفسیاتی مطالعے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی حیوان (seeking animal) ہے۔ انسان اپنے پورے وجود کے اعتبار سے ایک ذاتِ اعلیٰ کا متلاشی ہے، ایک ایسی اعلیٰ اور برتر ذات جو

اس کی کمیوں کی تلافی کرے، جو اس کے جذبات اور احساسات کا مرکز و محور بن سکے۔

اسماءِ حسنیٰ دراصل اسی سوال کا جواب ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کا مطلب ہے، صفاتِ حسنیٰ۔ خدا کی یہ صفات جو اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے بتائی گئی ہیں، وہ علی الاطلاق حیثیت سے خدائے برتر کا تعارف نہیں ہیں، بلکہ وہ انسان کی نسبت سے اس کے مطلوب خدا کا تعارف ہیں۔ چنانچہ جب کوئی انسان ان اسماءِ حسنیٰ کو ان کی پوری معنویت کے ساتھ جان لیتا ہے تو اچانک اس کو دریافت ہوتا ہے کہ وہ جس خدائے برتر کی تلاش میں تھا، اس کا تعارف اس کو اسماءِ حسنیٰ کی صورت میں مل گیا۔

مثال کے طور پر اسماءِ حسنیٰ میں سے ایک نام "الغنی" ہے۔ غنی کے لفظی معنی بے نیاز کے ہیں، یعنی وہ ہستی جس کو دوسروں سے کچھ لینے کی ضرورت نہ ہو، لیکن اس کو یہ طاقت ہو کہ وہ دوسروں کی تمام حاجتوں کو پورا کر سکے۔ یہ احساس ہر انسان کے اندر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جب انسان اسماءِ حسنیٰ کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ خدا کی ایک صفت اس کا غنی ہونا ہے، تو فوراً ہی وہ جان لیتا ہے کہ وہ جس خدا کی تلاش میں تھا، اس کو اس نے یہاں دریافت کر لیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بتائی گئی ہے: یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ، واللہ ھو الغنی الحمید۔ یعنی اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو، اور اللہ تو بے نیاز ہے، تعریف والا ہے (فاطر: 15)۔

اسی طرح ایک اور جذبہ، جو سارے انسانوں کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ ہر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو رزق کی محتاج ہے۔ رزق سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں، جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ انسان ہر لمحہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کا ضرورت مند ہے۔ پانی، غذا، ہوا، آکسیجن اور روشنی، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں نہایت متناسب انداز میں اور نہایت وافر طور پر دنیا میں موجود ہیں۔

انسان فطری طور پر یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو ان تمام ضروری چیزوں کو اس کے لئے مہیا کر رہا ہے' بغیر اس کے کہ وہ انسان سے اس کی کوئی قیمت طلب کر رہا ہو۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے اس محسنِ اعلیٰ کے احسانات کا اعتراف کرے' وہ کامل اعتراف اور شکر کے جذبے سے اپنے آپ کو اس کے آگے بچھا دے۔ یہاں اسماءِ حسنیٰ میں اس کو رہنمائی ملتی ہے۔

خدا کے ان ناموں میں سے ایک نام "الرزّاق" ہے۔ انسان جب خدا کو رزاق کی حیثیت سے دریافت کرتا ہے تو اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی طلب کا جواب پالیا۔ یہی وہ حقیقت ہے' جس کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین ۔یعنی بے شک' اللہ ہی رزق دینے والا' زور آور' زبردست ہے (الذّٰریات:58)

اسی طرح ہر انسان کی ایک اور ضرورت ہے۔ موجودہ دنیا جس میں انسان کو زندگی گزارنا ہے' وہ اس انداز سے بنی ہے کہ کوئی انسان اس کے اندر معیاری انداز میں نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح انسان کے اندر بہت سی خواہشیں اور تمنائیں ہیں۔ ان خواہشوں اور تمناؤں کے زیر اثر ہر آدمی بار بار غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ ان حالات میں ہر انسان یہ سوچتا ہے کہ کیسے وہ اپنی غلطیوں کے احساس سے اپنے آپ کو بچائے۔ کس طرح ایسا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ایک پاکیزہ روح کا درجہ دے سکے۔ یہاں اسماءِ حسنیٰ میں وہ اپنے لئے تسکین کا سامان پالیتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے' خدا کا ایک نام "الغفور" ہے۔ غفور کے تصور میں انسان پوری طرح اپنے لئے ذہنی تسکین کا سامان پالیتا ہے۔ قرآن کی یہ آیت اس معاملے میں انسان کی رہنما ہے: قل عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ' ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً' انہ ھو الغفور الرحیم ۔یعنی کہو کہ اے میرے بندو' جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک' اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا' مہربان ہے (الزمر:53)

پوائنٹ آف ریفرنس

قرآن میں خدا کے جو اسماءِ حسنیٰ بتائے گئے ہیں، ان میں سے ہر نام ہم کو غور و فکر کے لئے ایک پوائنٹ آف ریفرنس دیتا ہے۔ ان ناموں کے ذریعے ہم کو ایک متعین رہنمائی مل جاتی ہے، جس کو لے کر ہم خدا کی ہستی کا تصور کر سکیں اور اس کی مختلف صفات (attributes) کا تصور کرتے ہوئے خدا کی ہستی سے متعین نوعیت کا ذہنی رشتہ قائم کر سکیں۔ خدا سے اسی تعلق کا نام معرفت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کے لئے تمام اچھے نام ہیں، اس کے بعد فوراً یہ ارشاد ہوا ہے..... پس تم انہیں اچھے ناموں سے خدا کو پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو خدا کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں (الاعراف: 180) یعنی انہیں ناموں کے ذریعے خدائے کامل الصفات کا تصور قائم کرو، نہ کہ ان ناموں کے ذریعے جو دوسروں نے خود ساختہ طور پر بنا لئے ہیں۔

خدا کیا ہے۔ خدا ایک اعتبار سے ہمارے عجز (helplessness) کی تلافی ہے۔ انسان اپنی تخلیق کے لحاظ سے عاجز مطلق ہے، اور خدا خالق و مالک ہونے کی بنا پر قادر مطلق۔ اس لئے یہ فطری ہے کہ انسان ہر موقع پر خدا کو پکارے۔ خدا کے اسماءِ حسنیٰ اس کام میں انسان کے لئے مددگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خدا کے یہ تمام نام دراصل انسان کی نسبت سے ہیں۔ انسان اپنی نفسیات کے اعتبار سے جن خدائی حوالوں کا محتاج ہے، وہ تمام خدائی حوالے ان ناموں کے اندر موجود ہیں۔ آدمی کے اندر جب بھی اپنے عجز، اپنی عبدیت اور اپنی حیثیتِ انسانی کے اعتبار سے کوئی جذبہ جاگتا ہے تو یہ خدائی نام اس کو فوراً ایک رہنما لفظ دے دیتے ہیں۔ ان رہنما الفاظ کے ذریعے سے وہ اسی طرح خدائے رب العالمین سے مربوط ہو جاتا ہے، جس طرح ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کر کے وہ اپنی مطلوب شخصیت سے فی الفور ربط قائم کر لیتا ہے۔

چند مثالیں

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایک متلاشی حیوان (truth seeking animal) اس چھپی ہوئی فطرت کے زیر اثر آدمی کے اندر یہ جذبہ جاگتا ہے کہ کوئی برتر ہستی ہو جو اس کو ہدایت کی روشنی عطا فرمائے۔ اس وقت وہ پکار اٹھتا ہے کہ اے خدائے ہادی، تو مجھ کو اپنی رحمتِ خاص سے ہدایت عطا فرما۔

موجودہ دنیا میں انسان بار بار ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے، جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس وقت اس کی فطرت میں چھپا ہوا جذبہ چاہتا ہے کہ وہ ایک بالاتر ہستی کو پکارے۔ یہاں وہ اسماءِ حسنیٰ میں اس بالاتر ہستی کا ایک متعلق خدائی نام پالیتا ہے اور اس کے حوالے سے وہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اے خدا تو ہی میرا ناصر ہے، تو ہر اعتبار سے میری مدد فرما۔

انسان مجرد طور پر نہیں سوچ سکتا۔ اپنی ذہنی ساخت کے اعتبار سے انسان کو ہمیشہ الفاظ درکار ہوتے ہیں، جن کے ذریعے وہ کسی تصور کو اپنے ذہن میں لا سکے۔ خدا کے اسماءِ حسنیٰ کی نوعیت یہی ہے۔ یہ اسماءِ حسنیٰ یہ بتانے کے لئے نہیں ہیں کہ مطلق طور پر خدا کے نام کیا کیا ہیں، وہ صرف ان اسماء کو بتاتے ہیں جو انسان کی نسبت سے ہم کو درکار ہیں۔ گویا کہ یہ اسماءِ حسنیٰ ضرورتِ انسانی کے اعتبار سے بتائے گئے ہیں، نہ کہ خود ذاتِ خداوندی کی حقیقت اعلیٰ کے اعتبار سے۔

اسماءِ حسنیٰ سے مراد صفاتِ حسنیٰ ہیں، مگر اسماءِ حسنیٰ خود خدا کی مطلق نسبت سے خدا کا تعارف نہیں ہیں، وہ انسان کی نسبت سے خدا کا تعارف ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ دراصل ذکر اور دعا کے لئے انسان کو پوائنٹ آف ریفرنس دیتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو رزق درکار ہے تو وہ خدا سے کہہ سکے کہ.....اے رزاق، تو مجھے رزق دے دے۔ ایک شخص اپنے کو عاجز محسوس کرتا ہے، تو وہ کہہ سکے کہ.....اے قادرِ حقیقی، تو میرے عجز کی تلافی فرما۔

پُراسرار نہیں

اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ حروفِ مقطعات کی مانند کچھ پراسرار الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کے اندر کوئی معجزاتی تاثر چھپی ہوئی ہے' جیسے کہ جادوگروں کے منتر میں ہوتی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم ان کو یاد کر کے ان کا ورد کرتے رہیں۔ اور پھر پراسرار طور پر ہمیں ان کے انوکھے فوائد ملتے رہیں گے۔ اکثر لوگوں کے دماغ میں اسی قسم کا تصور بسا ہوا ہے۔

مگر اسماءِ حسنیٰ کے بارے میں اس قسم کا تصور سرتاسر بے بنیاد ہے۔ اسماءِ حسنیٰ کسی بھی درجے میں پراسرار الفاظ نہیں' وہ پورے معنوں میں ایک معلوم اور بامعنی حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ کا معاملہ بلاشبہ انسان کے لئے ایک عظیم رحمت کا معاملہ ہے۔ مگر یہ رحمت کوئی پراسرار رحمت نہیں' بلکہ وہ ایک ایسی رحمت ہے جو پوری طرح ہمارے معلوم دائرے کی چیز ہے اور علمی طور پر اس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔

اسماءِ حسنیٰ دراصل' خدا کی رحمتوں کے معلوم دروازے ہیں۔ قرآن میں ان دروازوں کو اس لئے کھولا گیا ہے کہ آدمی ان کی دریافت کرے اور ان کے راستے سے گزر کر وہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں پہنچ جائے۔ اسماءِ حسنیٰ گویا کہ رحمت خداوندی کے ابواب حسنیٰ ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ ہم کو خدا سے مربوط کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اسماءِ حسنیٰ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی وہ کلیدِ معرفت ہے جو ہمارے دل و دماغ کو بیدار کرتی ہے اور ہم کو تاریکی سے روشنی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔

اسماءِ حسنیٰ اور انسان

اگر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں کمیونکشین کی تاریخ بتائی گئی ہو۔ اس کتاب میں نامہ بر کبوتر' ٹیلی گراف' ٹیلی فون اور موبائل جیسے نام ہوں۔ اس کتاب کو ایک شخص پڑھے' خواہ وہ

کتاب کی زبان سے بخوبی واقف ہو لیکن اگر نامہ بر کبوتر، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور موبائل جیسی چیزوں کو اس نے دیکھا نہ ہو تو وہ ان چیزوں کی حقیقت کے بارے میں کچھ نہ جان سکے گا۔ اس قسم کی کوئی کتاب ایک واقف کار انسان کے لئے ایک معلوماتی کتاب ہے، لیکن ایک ناواقف انسان کے لئے وہ صرف ایک معمّا بن کر رہ جائے گی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اسماءِ حسنیٰ کا ہے۔ خدا کے اسماءِ حسنیٰ، قرآن اور حدیث میں نام بہ نام بتادئے گئے ہیں۔ لیکن ان ناموں کو قرآن اور حدیث میں پڑھ لینا کافی نہیں۔ قرآن اور حدیث میں بیان ہونے کے باوجود یہ تمام نام کسی انسان کیلئے ایک نامعلوم چیز کی دریافت (discovery) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی آدمی ان ناموں کی حقیقت کو صرف اس وقت جان سکتا ہے، جب کہ اس سے پہلے وہ ذاتی دریافت کی سطح پر ان کا علم حاصل کر چکا ہو۔ ذاتی دریافت کے بغیر یہ نام کسی آدمی کیلئے صرف رسمی نام ہوں گے، نہ کہ معرفتِ خداوندی کا خزانہ۔

اسمِ اعظم

اسماءِ حسنیٰ کے ذیل میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا خدا کا کوئی اسمِ اعظم ہے، اور اگر ہے تو وہ کیا ہے۔ اسم اعظم کے متعلق مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اس سلسلے میں مسند امام احمد کی دو روایتیں اس طرح ہیں:

۱. عن انس بن مالک ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سمع رجلاً یقول: اللھم انی اسئلک ان لک الحمد، لا الہ الا انت وحدک، لا شریک لک، المنّان، بدیع السمٰوٰت والارض، ذالجلال و الاکرام. فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لقد سالت اللہ با سم اللہ الاعظم، الذی اذا دعی بہ اجاب، واذا سئل بہ اعطیٰ (جلد 3، صفحہ 120)

2۔ عن عبد اللہ بن بریدۃ عن ابیہ قال: سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً یقول اللھم انی اسئلک باننی اشھد انک انت اللہ، الذی لا الہ الا انت، الاحد الصمد، الذی لم یلد ولم یولد، ولم یکن لہ کفواً احد، فقال: قد سالت اللہ باسم اللہ الاعظم، الذی اذا سئل بہ اعطیٰ، واذا دعی بہ اجاب (جلد 5، صفحہ 350)

ترجمہ: انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ تیرے ہی لئے حمد ہے۔ تو ہی الٰہ ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ تو بڑا احسان کرنے والا ہے۔ زمین اور آسمان کو کسی نمونے کے بغیر پیدا کرنے والا ہے۔ تو عزت اور کبریائی والا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے اللہ کو اس کے اس اسمِ اعظم کے ساتھ پکارا، جس کے ساتھ اس کو پکارا جائے تو وہ ضرور پکار کا جواب دیتا ہے، اور جب اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو وہ عطا کرتا ہے۔

عبداللہ بن بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تو اکیلا ہے، تو بے نیاز ہے۔ تو نے نہ کسی کو جنا اور نہ تجھے کسی نے جنا۔ اور تیرے برابر کوئی نہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو نے اللہ سے اس کے اُس اسم اعظم کے ساتھ سوال کیا ہے، جس کے ساتھ اس سے مانگا جائے تو وہ ضرور عطا کرتا ہے اور جب اس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ ضرور اس کو قبول کرتا ہے۔

دونوں روایتوں میں اللہ کے ساتھ اس کے اور کئی صفاتی نام آئے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسمِ اعظم سے مراد کوئی ایک نام نہیں ہوسکتا۔ اگر اسمِ اعظم کوئی ایک نام ہوتا تو صحابی کی مذکورہ دعا میں بھی صرف وہی ایک نام ہوتا، جب کہ اس دعا میں واضح طور پر خدا

کے کئی نام ہیں۔اس واضح اشارے کے باوجود اسمِ اعظم کو خدا کا کوئی ایک نام سمجھنا اور اسی ایک نام کی تلاش میں لگے رہنا' بلاشبہہ ایک غلطی ہوگی۔اسمِ اعظم کسی لفظِ اعظم کا نام نہیں ہے بلکہ وہ مفہومِ اعظم کا نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمِ اعظم سے مراد خدا کا کوئی ایک نام نہیں ہے' بلکہ وہ خصوصی کیفیت کے ساتھ خدا کو پکارنے کا نام ہے۔اسمِ اعظم سے مراد اسم اعظم نہیں ہے بلکہ کیفیتِ اعظم ہے۔مذکورہ دعا میں صحابی نے کسی رٹے ہوئے دعائیہ لفظ کو استعمال نہیں کیا' بلکہ جذبات کے وفور میں ان کی زبان سے کچھ خاص الفاظ نکل گئے' اسی کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنا ہے۔اسمِ اعظم کا تعلق دراصل ربانی کیفیت سے ہے۔کیفیت سے بھرے ہوئے الفاظ میں خدا کو پکارنے کا نام اسمِ اعظم ہے۔

ایک وضاحت

مذکورہ حدیث میں ایک صحابی کی دعا کا ذکر ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ دعا کے متعلق فرمایا کہ یہ دعا اسمِ اعظم کی دعا تھی۔چوں کہ یہ دعا صحابی نے عربی زبان میں کی تھی' اس لئے لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اسمِ اعظم والی دعا وہی ہے جو عربی زبان میں کی گئی ہو' غیر عربی زبان کی دعا اسمِ اعظم کی دعا نہیں۔

مگر یہ سوچ درست نہیں۔اپنی حقیقت کے اعتبار سے' صحابی نے جو دعا کی' وہ ان کی اپنی مادری زبان میں تھی' نہ کہ سادہ طور پر عربی زبان میں۔دعا کو عربی زبان کے ساتھ مخصوص کرنا' ایک غیر فطری نظریہ ہے۔دعا دل کے جذبات کا نام ہے' نہ کہ کسی زبان کے الفاظ کا نام۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں بھیجا گیا (ابراہیم :4) یہی معاملہ دعا کا بھی ہے۔جس طرح دعوت مخاطب قوم کی زبان میں ہوتی ہے' اسی طرح دعا' دعا کرنے والے کی اپنی مادری زبان میں ہوتی ہے۔

ایسا ماننا بہت ضروری ہے۔اس لئے کہ اگر دعا کو عربی زبان کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے یا عربی زبان کی دعا کو افضل دعا بتایا جائے تو یہ دعا کی اصل روح کو ختم کرنے کے ہم معنی ہوگا۔دعا کسی قسم کی تکرار الفاظ کا نام نہیں' دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار کا نام ہے' اور ایسی دعا ہمیشہ آدمی کی اپنی مادری زبان ہی میں ظہور میں آتی ہے۔

دعا کیا ہے

دعا کسی ٹکنیکل واقعے کا نام نہیں' دعا ایک داخلی طوفان کا خارجی اظہار ہے۔جب ایک انسان خدا کو اس کی عظمت و کبریائی کے ساتھ دریافت کرتا ہے' جب ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کو خدا کی موجودگی کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ خدا کے پڑوس میں پہنچ گیا ہے۔جب اس پر وہ طوفانی تجربہ گزرتا ہے' جس کو حدیث میں: ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ (البخاری' کتاب الرقاق) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے' یعنی آدمی نے اپنی تنہائی میں خدا کو یاد کیا اور شدتِ تاثر سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔اس نے دنیائے امتحان کے بارے میں سوچا' اس نے موت اور روزِ حساب کا گہرا ادراک کیا' وہ ان ربانی کیفیات سے گزرا' جب کہ انسان کو جہنم کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اس کو جنت کے ابدی مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔جب اس پر یادِ خداوندی کا وہ گہرا تجربہ گزرتا ہے' جب کہ سب کچھ اس کی نظروں سے محو ہو جاتا ہے' خدا کے سوا ہر چیز اس کی نظر میں بے حقیقت بن جاتی ہے۔

ایسے طوفان خیز لمحات میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ایک بھونچال آجاتا ہے۔اس کی آنکھوں سے خوفِ خدا کا سمندر امڈ پڑتا ہے۔جب سوچنے کی صلاحیت بظاہر ختم ہو جاتی ہے اور صرف محسوس کرنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ انسان بے تابانہ طور پر اپنے رب کو پکارنے لگتا ہے۔اس کے اندر چھپی ہوئی ربانی فطرت

الفاظ کی صورت میں بہہ پڑتی ہے۔ ایسے طوفانی لمحات میں آدمی کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، اسی کا نام دعا ہے۔ یہی وہ دعا ہوتی ہے جو اسمِ اعظم کی زبان میں نکلتی ہے اور ایسی دعا ہمیشہ اپنی پہلی زبان میں ہوتی ہے، نہ کہ اپنی دوسری زبان میں۔

ایک واقعہ

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں دس سال سے ایک سوال کا جواب تلاش کر رہا ہوں، لیکن اب تک مجھے اس کا جواب نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا وہ کیا سوال ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسمِ اعظم کیا ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں، بہت سے علماء اور بزرگوں سے ملاقاتیں کیں، مگر اب تک کسی نے اس کا تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آپ مجھے اس کا جواب دے کر میری پریشانی کو دور فرمائیں۔

میں نے کہا آپ کی پریشانی ایک خود ساختہ پریشانی ہے۔ آپ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اسمِ اعظم جادو کے منتر کی طرح کوئی منتر ہے۔ اب آپ چاہتے ہیں کہ منتر کا وہ لفظ آپ کو معلوم ہو جائے، مگر ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ اسمِ اعظم کسی لفظ کا نام نہیں ہے، بلکہ کیفیت کا نام ہے۔ کیفیتِ اعظم کے ساتھ جو دعا کی جائے وہی اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ یہ دراصل آپ کی اپنی قلبی کیفیت ہے جو کسی دعا کو اسمِ اعظم کی دعا بناتی ہے۔ کسی انسانی لفظ میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا کا اسمِ اعظم بن جائے، وہ خدا کی لامحدود ہستی کا احاطہ کر لے۔

میں نے کہا کہ آپ ہی کی طرح کا ایک شخص تھا۔ اس کو ایک خزانے کی تلاش تھی۔ اس کو معلوم ہوا کہ یہ خزانہ فلاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک محل کے اندر رکھا ہوا ہے۔ اس محل کے گیٹ پر ایک تالا لگا ہوا ہے۔ یہ تالا کسی کنجی سے نہیں کھلتا، بلکہ وہ ایک منتر سے کھلتا ہے۔ اب اس کو اس

منتر کی تلاش ہوئی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایک جگہ پہنچا یہاں اس کی ملاقات ایک سادھو سے ہوئی۔ جو اس منتر کو جانتا تھا۔

اس نے سادھو سے درخواست کی کہ وہ اس کو یہ منتر بتادے۔ سادھو نے اس کو وہ منتر بتادیا۔ سادھو نے کہا کہ وہ منتر ''سم سم'' ہے۔ تم فلاں پہاڑ کی چوٹی پر جاؤ۔ وہاں تم کو ایک محل ملے گا۔ اس محل کے گیٹ پر ایک تالا لٹکا ہوا ہوگا۔ تم اس کے سامنے کھڑے ہوکر کہنا: ''کھل اے سم سم' کھل اے سم سم' پھر وہ تالا کھل جائے گا۔ وہ آدمی روانہ ہوا۔ لمبے سفر کے بعد وہ محل کے گیٹ پر پہنچا' مگر اس وقت وہ منتر کو بھول چکا تھا۔ وہ گیٹ کے سامنے کھڑا ہوکر دوسرے دوسرے الفاظ بولتا رہا۔ مثلاً کھل اے ٹم ٹم' کھل اے دم دم' کھل اے بم بم' مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اب وہ وہاں سے واپس ہوکر دوبارہ سادھو کے پاس گیا۔ سادھو نے کہا کہ تم غلط منتر بول رہے تھے' اس لئے تالا نہیں کھلا۔ دوبارہ جاؤ اور سم سم کہو۔ آدمی نے منتر کو خوب اچھی طرح یاد کرلیا اور سفر کرکے دوبارہ وہاں پہنچا۔ اس نے محل کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہوکر کہا: کھل جا اے سم سم اور پھر فوراً دروازہ کھل گیا۔

اکثر لوگ اسم اعظم کو اسی قسم کا ایک طلسماتی لفظ سمجھتے ہیں' مگر اس قسم کی سوچ بلکل غلط ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسم اعظم ڈکشنری کے کسی لفظ کا نام نہیں' وہ انسان کی اپنی داخلی کیفیت کا نام ہے۔ جب بھی کوئی سچا بندہ' اعلیٰ قلبی کیفیات کے ساتھ دعا کرتا ہے تو اس کو فرشتوں کی مدد حاصل ہوجاتی ہے۔ اس وقت اس کے اندر سے مخصوص قسم کے ربّانی الفاظ نکلنے لگتے ہیں' اسی کا نام اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ اس قسم کی دعا' خدائی الہام کے تحت ہوتی ہے اور جو دعا خدائی الہام کے تحت انسان کے دل سے نکلے' اس کا معاملہ وہی ہوتا ہے جو ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

مقبول دعا

حقیقی دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے، نہ کہ محض زبانی الفاظ سے۔ یہ ایک حقیقت ہے کے خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگنا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں۔ مانگنا وہی مانگنا ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہوگئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو: خدایا مجھے اپنا بنالے، مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں، اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی، خواہ وہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کئے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے، آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کردے'' آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور خدا آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دین داری مانگیں اور خدا آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور خدا آپ کو گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا چھوڑ دے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں، مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا، جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا، میں

نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے وہ چیز نہ دی۔ بخدا' یہ ناممکن ہے' یہ ناممکن ہے' یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آ کر آواز دیتا ہے..... ''کون ہے جو مجھ سے مانگے' تا کہ میں اسے دوں'' مگر جنہیں لینا ہے وہ اس سے غافل بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

دعا کی طاقت

حدیث میں آیا ہے کہ: لا یرد القضاء الا الدعاء (الترمذی' کتاب القدر) یعنی قضا اور قدر کے فیصلے کو صرف دعا بدل سکتی ہے۔ خدا نے اس دنیا کا نظام اسباب و علل کی بنیاد پر قائم کیا ہے' اور پھر انسان کو مکمل آزادی دے دی ہے۔ اب انسان اپنی آزادی کے مطابق عمل کرتا ہے اور خدا کے قائم کردہ نظام اسباب و علل سے مطابقت یا مخالفت کی بنیاد پر اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظام بالکل حتمی ہے۔ کوئی آدمی خواہ مخلص ہو یا غیر مخلص' اس کو بہر حال اسی نظام کو بھگتنا ہے۔ کسی بھی شخص کے لئے اس نظام کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

اس معاملے میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ دعا کا ہے۔ کوئی آدمی جب سچی دعا کرتا ہے اور اس وقت اگر خدا اس کی دعا قبول کر لیتا ہے تو وہ اسباب کے نظام میں مداخلت کر کے اس کا راستہ ہموار کر دیتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس بات کا کہ دعا' قضا اور قدر کو بدل دیتی ہے۔

لیکن دعا الفاظ کی تکرار کا نام نہیں ہے' حتی کہ قرآنی دعائیں یا ماثور دعائیں بھی اگر صرف رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار ہوں تو وہ بھی موثر نہیں ہو سکتیں۔ نظام قضا کو بدلنے کے لئے وہ دعا درکار ہے جو دل کو پھاڑ کر کی جاتی ہے' جو دل کی پھٹن کی آواز ہوتی ہے' جس میں آدمی کا پورا وجود شامل ہو جاتا ہے' جو انسانی شخصیت میں ایک بھونچال کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

اس قسم کی دعا کی قبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والے کا ذہنی تزکیہ اتنا زیادہ

ہو چکا ہو کہ اس کی سوچ خدا کی سوچ بن جائے۔ ایسا آدمی وہی دعا کرے گا جو خدا کے نزدیک قابل قبول ہوتی ہے۔ اس کی زبان سے ایسی دعا نہیں نکلے گی جو خدا کی سنت کے مطابق، قابل قبول ہی نہیں۔

پیغمبر کی دعا کی مثال

خدا کے تمام پیغمبروں نے اسمِ اعظم کے ساتھ دعائیں کی ہیں۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے موقع پر میدان جنگ کی طرف نگاہ ڈالی تو آپ کو نظر آیا کہ طاقت ور مشرک فوج کے مقابلے میں، موحدین کی ایک کمزور فوج کھڑی ہوئی ہے، جو تعداد میں بھی کم ہے اور سامانِ حرب میں بھی کم۔ اس نابرابری کو دیکھ کر آپ کے جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ آپ کمالِ عجز کے ساتھ خدا کے سامنے زمین پر سجدے میں گر پڑے۔ اس وقت آپ کی زبان سے دعا کرتے ہوئے یہ الفاظ نکلے:

اللھم، ان تھلک ھذا العصابة من اھل الاسلام، لاتعبد فی الارض ابدا

(مسند احمد، جلد ۱، صفحہ 30) یعنی اے اللہ، اگر تو اہلِ اسلام کے اس گروہ کو آج ہلاک کر دے تو اس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ دعا بھی اپنے ربانی جذبات کے اعتبار سے اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا تھی، جو کامل طور پر قبول ہوئی۔ کمزور گروہ نے خدا کی مدد سے طاقت ور گروہ کو مکمل شکست دیدی۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا، صرف پیغمبروں کے ساتھ خاص نہیں، اس دعا کی توفیق ہر بندۂ خدا کو ملتی ہے۔ جو شخص بھی ایمان اور اخلاص کے اعلیٰ ربانی جذبات کے ساتھ خدا کی طرف رجوع ہو، وہ خدا کی مدد سے اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ ایسی دعا کے موقع پر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا پورا وجود خدا کی تجلی میں نہا اٹھا ہے۔ اس وقت وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اس نے اس سے پہلے کبھی سوچے نہیں تھے۔

تاریخ میں بہت سے خدا کے بندے ہیں، جن کو اس قسم کی دعاءِ اعظم کی توفیق ملی ہے۔

دعا کے ذریعے شرکت

قرآن کی سورہ نمبر 9 میں کچھ اہل ایمان کا ذکر ہے۔ غزوۂ تبوک (8 ہجری) کے موقع پر چوں کہ نفیر عام تھی، اس لئے وہ اس میں جانا چاہتے تھے۔ مگر ان کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اس طویل سفر کے لئے ضروری سامان کی تیاری کر سکیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدد کے لئے آئے، مگر آپ نے معذرت فرمائی۔ اس واقعے کا اشارہ قرآن کی ایک آیت میں اس طرح کیا گیا ہے: اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ تمہارے پاس آئے کہ تم ان کو سواری دو، تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ میں تم کو اس پر سوار کروں، تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے، اس غم میں کہ انہیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں (التوبہ:92)

یہ افراد غزوہ تبوک میں شریک نہ ہو سکے، مگر ایک حدیثِ رسول کے مطابق، خدا کے نزدیک وہ اس میں شریک مانے گئے۔ غزوہ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے متعلق اپنے اصحاب سے فرمایا: **بالمدینة اقواماً، ماسرتم میسرا، ولا انفقتم من نفقة، ولا قطعتم من واد، الا وھم معکم فیه** ۔یعنی مدینہ میں کچھ ایسے افراد ہیں کہ تم جب کسی راستے پر چلے، یا جب بھی تم نے کچھ مال خرچ کیا، یا تم کسی وادی سے گزرے تو وہ اس میں تمہارے ساتھ تھے (القرطبی، جلد 8، صفحہ ۲۹۲، مسند احمد، جلد 3، صفحہ 103)

یہ بڑا عجیب انعام تھا جو مدینہ کے ان افراد کو ملا، یعنی عمل کے بغیر عمل کے انعام میں شرکت۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ انوکھا انعام ان کو اسم اعظم کے ساتھ دعا کی بنا پر ملا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ، جیسے کہ وہ اپنی تنہائیوں میں رو رو کر یہ دعا کر رہے ہوں کہ.....

خدایا' تو نے دوسروں کو جو انعام عادل ہونے کی حیثیت سے دیا' وہ انعام مجھ کو رحیم ہونے کی حیثیت سے دے دے۔ تو نے دوسروں کے لئے جو چیز ان کے عمل کے بنا پر مقدر کی' وہ چیز میرے لئے میری دعا کے نتیجے میں مقدر کر دے۔ تو نے جو کچھ دوسروں کو استحقاق کی بنا پر عطا فرمایا' وہ چیز مجھ کو سوال کرنے والے کی حیثیت سے دے دے۔ دوسروں کو جو چیز تو نے استطاعت کی بنا پر دی' وہ مجھ کو عجز کی بنا پر دے دے۔ تو نے دوسروں کو جو چیز مومنِ قوی ہونے کی حیثیت سے دی' وہ مجھ کو مومنِ ضعیف ہونے کی حیثیت سے دیدے' کیوں کہ تیرے رسول نے ہم کو یہ خبر دی ہے کہ: ضعیف مومن کے لئے بھی خیر ہے (وفی کل خیر' صحیح مسلم' کتاب القدر)۔

اسمِ اعظم کا علم خدا کو

اسمِ اعظم' اسماءِ حسنیٰ سے الگ کوئی نام نہیں' وہ انہیں ناموں میں شامل ہے۔ اسماءِ حسنیٰ میں سے کوئی اسم' اس وقت اسم اعظم بن جاتا ہے' جب کہ دعا کرنے والا اس کو ایک غیر معمولی جذبے کے تحت استعمال کرے۔ پکارنے والے کا جذبہ' اعظم' اسماءِ حسنیٰ میں سے کسی اسم کو اسمِ اعظم بنا دیتا ہے۔

اسمِ اعظم کوئی پراسرار منتر نہیں' وہ مکمل طور پر ایک معلوم حقیقت ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پکارنے والا یہ جانے کہ اس نے اسمِ اعظم کے ذریعہ خدا کو پکارا ہے۔ یہ دراصل خدا کی قبولیت ہے جو کسی اسم کو اسمِ اعظم کا درجہ دے دیتی ہے۔ اسم بظاہر ایک معلوم لفظ کا نام ہے' لیکن کسی چیز کا اسمِ اعظم ہونا' تمام تر داخلی اسپرٹ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ چوں کہ داخلی اسپرٹ کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' اس لئے یہ صرف اللہ ہے جو جانتا ہے کہ کب اس کے بندے نے اس کو اسمِ اعظم کے ساتھ پکارا۔ یہ حقیقت صرف آخرت میں کھلے گی کہ وہ کون خوش قسمت انسان تھا جس کو اسمِ اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس

معاملے میں اگر ہم کچھ کہتے ہیں تو وہ صرف بر بناءِ قیاس ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو حقیقی علم کی بنیاد پر اس بارے میں کوئی رائے دے سکے۔

خدا اور بندے کے درمیان

خدا نے انسان کے لئے اپنے جن اسماءِ حسنیٰ کا تعارف کرایا ہے، وہ انسان کے اوپر ایک دروازۂ رحمت کھولنے کے ہم معنی ہے۔ اسماءِ حسنیٰ یہ بتاتے ہیں کہ بندے اور خدا کے درمیان مواقع اتصال (meeting points) کیا کیا ہیں۔ ان مواقع اتصال کے ذریعے بندہ، خدا سے قربت حاصل کرسکتا ہے۔ پھر اگر بندے کی اسپرٹ بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ذکر اور اپنی دعا میں اسمِ اعظم کا استعمال کرسکے، یعنی اس اسم یا نام کا استعمال جس کے استعمال کے بعد ربّانی اتصال اچانک اسی طرح ممکن ہوجاتا ہے، جس طرح بجلی کا سوئچ دبانے کے بعد اچانک بجلی کے بلب کا فوراً روشن ہوجانا۔

یہ معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت کا ایک قانون ہے، جس کو خود انسانوں کے درمیان محسوس تعلقات کا مطالعہ کرکے سمجھا جاسکتا ہے۔

دعا اور سپر دعا

دعا، یا خدا کو پکارنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سادہ طور پر کچھ متعین الفاظ بول کر خدا سے مانگنا۔ دوسری دعا وہ ہے جس کو سپر دعا کہا جاسکتا ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس کو پکارنے والا ایسے الفاظ اور ایسے انداز میں پکارتا ہے کہ وہ خود خدا کے لئے، بلاتشبیہہ، اسی طرح ایک ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے، جس طرح وہ دعا کرنے والے کے لئے ایک ذاتی مسئلہ تھا۔ پہلی دعا اگر روایتی دعا (traditional dua) ہے تو دوسری دعا تخلیقی دعا (creative dua) ہے۔ انگریزی میں پہلی قسم کی دعا کو ریکویسٹ (request) کرنا کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کی دعا کو اِنووک (invoke) کرنا، جیسے کہ کہا جائے:

The Almighty God was invoked by his call.

دعا اور اسم اعظم کی دعا میں یہی فرق ہے۔ دعا عام قسم کی ایک دعا ہے' اور اسم اعظم کی دعا گویا کہ ایک سپر دعا۔ یہاں ہم ایک واقعہ نقل کریں گے جو سپر دعا کے معاملے کو سمجھنے کے لئے ایک واضح مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک واقعہ

رام پور (یوپی) کا واقعہ ہے۔ ایک بچے نے اپنے باپ سے کہا کہ..... میرے لئے ایک بائسیکل خرید دیجئے۔ باپ کی آمدنی کم تھی' وہ بائسیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا' اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا: میں نے کہہ دیا کہ میں بائسیکل نہیں خرید سکتا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا' ورنہ میں تم کو ماروں گا۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اسکے بعد وہ روتے ہوئے بولا۔ آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں' آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ اس جملے نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو' میں تمہارے لئے بائسیکل خریدوں گا' اور کل ہی خریدوں گا۔ یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اگلے دن اس نے پیسے کا انتظام کر کے بیٹے کے لئے ایک نئی بائسیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا' مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی' جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایسے نقطے پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کیلئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا کہ وہ خود اس کیلئے تھی۔ بیٹے کے الفاظ نے باپ کو اس سنگین سوال سے دوچار کر دیا

کہ اگر وہ اپنے بیٹے کو بائسیکل نہ دے تو اس کی پدریت (fatherhood) مشتبہ ہو جائے گی۔

اس واقعے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دعا کی وہ کون سی قسم ہے جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے' نہ اس کا کوئی ''رسمی نصاب'' ہے۔ یہ دعا کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین اور آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ ''مانگنے والا'' اور ''دینے والا'' دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا' محض لغت کا ایک لفظ نہیں ہوتا' بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں۔ قادرِ مطلق' عاجزِ مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

اس واقعے پر غور کیجئے تو اس میں دونوں قسم کی دعا کی مثال نظر آئے گی۔ مذکورہ بچے نے جب پہلی بار اپنے باپ سے یہ کہا کہ مجھے ایک بائسیکل خرید دیجئے تو اس نے گویا کہ صرف دعا کی' لیکن دوسری بار جب اس نے رو کر یہ کہا کہ آپ ہی تو ہمارے پاپ ہیں' آپ سے بائسیکل کے لئے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں۔ جب بچے کی زبان سے یہ دوسرے الفاظ نکلے تو وہ گویا کہ ایک سپر دعا تھی۔ پہلے قسم کے الفاظ سے باپ پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا' لیکن دوسرے قسم کے الفاظ نے باپ کو پگھلا دیا۔ اب وہ اتنا متاثر ہوا کہ وہ فوراً بائسیکل خریدنے کیلئے تیار ہو گیا۔

اس مثال سے عام قسم کی دعا اور اسمِ اعظم کی دعا کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ عام قسم کی دعا' محض دعائیہ الفاظ کو زبان سے دہرا دینے کا نام ہے' لیکن اسمِ اعظم کے ساتھ کی گئی دعا گویا کہ سپر دعا ہے۔ ایسی دعا خود خدا کو ہلا دیتی ہے' جیسا کہ مظلوم کی دعا کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: دعوۃ المظلوم تحمل علی الغمام' و تفتح لھا ابواب السماء' یقول

الرب عزوجل: وعزتی، لانصرنک ولو بعد حین (مسند احمد، جلد 2، صفحہ 305)

دعا اور سپر دعا کا فرق، الفاظ میں فرق کا نام نہیں، بلکہ دعا کرنے والے کی داخلی اسپرٹ میں فرق کا نام ہے۔ یہ دراصل دعا کرنے والے کی اپنی حالتِ داخلی پر منحصر ہے کہ اس کی زبان سے نکلنے والی دعا، سپر دعا بنے گی یا وہ صرف عام دعا بن کر رہ جائے گی۔

دو مثالیں

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے دونوں قسم کی دعاؤں کی مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ایک شخص نے قرآنی دعاؤں کی ایک کتاب بازار سے خریدی۔ اس میں کچھ دعائیں چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے ان دعاؤں کو یاد کر لیا اور نمازوں میں ان کو دہرانے لگا۔ مثلاً یہ دعا: ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النار۔ یعنی اے ہمارے رب تو ہم کو دنیا میں 'حسنہ' دے اور تو ہم کو آخرت میں 'حسنہ' دے اور، تو ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (البقرۃ: 201)۔ دعا کا یہ طریقہ روایتی دعا کی ایک مثال ہے۔

اب سپر دعا کی ایک مثال لیجئے۔ اب سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں ایک مشرک بادشاہ کی حکومت تھی، جس کا لقب فرعون تھا۔ اس زمانے میں حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا، جنھوں نے مصر میں دعوتِ توحید دی۔ فرعون خود تو حضرت موسیٰ کا مخالف بن گیا، لیکن اسکی بیوی آسیہ بنت مزاحم، حضرت موسیٰ کی دعوتِ توحید سے متاثر ہوئی اور وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لے آئی۔

قدیم زمانے کے اعتبار سے یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ قدیم زمانہ 'الناس علی دین ملوکھم' کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اسٹیٹ ریلیجن کو ماننا، سیاسی وفاداری کی علامت تھا۔ اسٹیٹ ریلیجن کے خلاف کسی اور ریلیجن کو ماننے والا، اسٹیٹ کا باغی سمجھا جاتا تھا اور اس کو وہ سزا دیجاتی تھی جو ریاست سے بغاوت کے لئے مقرر ہے۔ آج ہم مذہبی آزادی کے

ماحول میں جیتے ہیں' لیکن قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک دنیا میں مذہبی جبر (religious persecution) کا نظام رائج تھا۔

یہی وہ پس منظر تھا جس میں فرعون نے آسیہ کے لئے قتل کا حکم دے دیا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت آسیہ کی زبان سے یہ دعا نکلی: رب بن لی عندک بیتا فی الجنة۔ یعنی اے میرے رب' اپنے پاس میرے لئے جنت میں ایک گھر بنا دے (التحریم:11)

آسیہ کی اس دعا کو اس کے پس منظر کی روشنی میں دیکھئے تو گویا کہ آسیہ نے یہ کہا..... اے میرے رب' میں نے تیرے لئے دنیا میں بادشاہ کے محل کو چھوڑ دیا' اب تو آخرت کی ابدی دنیا میں میرے لئے اپنے پڑوس میں ایک محل بنا دے:

I sacrifice my seat in the palace of worldly king, O Lord, give me a better seat in your neighbourhood in the world hereafter.

آسیہ بنت مزاحم کی اس دعا کے لئے بعض علما نے درست طور پر کہا کہ: ما احسن هذا الکلام' یعنی کتنی اچھی ہے یہ دعا (صفوة التفاسیر' جلد3' صفحہ 412)

یہ دعا بلاشبہہ' ایک تخلیقی دعا تھی۔ آسیہ بنت مزاحم کے سامنے دو چیزوں کے درمیان انتخاب تھا۔ محل کی زندگی کی خاطر فرعون کے مشرکانہ مذہب پر قائم رہنا' یا خدا کے موحدانہ مذہب کی خاطر سفاکانہ قتل کا سامنا کرنا۔ آسیہ کی معرفت اس وقت اتنی زیادہ گہری ہو چکی تھی کہ اس کو یہ فیصلہ کرتے ہوئے ایک لمحے کی دیر نہیں لگی کہ مجھے حق کی خاطر' دنیا کے وقتی محل کو چھوڑ دینا چاہئے اور خدا کی ابدی جنت کو اپنے لئے منتخب کر لینا چاہئے' خواہ اس انتخاب کی قیمت میں مجھے قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے۔

اس پورے پس منظر کی روشنی میں دیکھئے تو آسیہ بنت مزاحم کی دعا بلاشبہہ ایک سپر دعا تھی اور وہ فوراً قبول ہوگئی۔ روایات میں آیا ہے کہ موت سے پہلے فرشتوں نے آسیہ کو جنت میں اس کے محل کا مشاہدہ کرایا۔ چنانچہ آسیہ نے اس حال میں جان دی کہ اس کے چہرے پر اطمینان کی خوشی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

آسیہ بنت مزاحم کی یہ دعا جو قرآن میں نقل کی گئی، وہ محض ایک فرد کی دعا نہیں ہے بلکہ وہ ایک نمائندہ دعا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عورت اور مرد کو یہی دعا کرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو اسی مرحلے سے گزرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو قربانی کی سطح پر جا کر یہ کہنا ہے کہ..... خدایا، میں نے تیرے دین کی خاطر دنیا کی چیزوں کو چھوڑا، تاکہ تو اگلے مرحلۂ حیات میں اپنا زیادہ بہتر انعام مجھے عطا فرمائے۔ یہی وہ عورت اور مرد ہیں جن کی بابت یوم الحساب (Day of Judgement) کے موقع پر یہ اعلان کیا جائے گا کہ انہوں نے خدا کی خاطر دنیا کی عارضی جنت کو چھوڑ دیا تھا، اب ان کو آخرت کی زیادہ اعلیٰ جنت میں داخل کردو، تاکہ یہاں وہ ابدی طور پر خوشیوں اور راحتوں کی زندگی گزاریں اور کبھی اکتاہٹ کے احساس کا شکار نہ ہوں۔

اسم اعظم ایک زندہ تجربہ

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا، خدا کی توفیق سے ہوتا ہے۔ یہ توفیق صرف اس انسان کو ملتی ہے جو اسم اعظم کی دعا سے پہلے اسم اعظم کی کیفیات میں جی رہا ہو۔ اسم اعظم کے ساتھ دعا کا معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ وہ دراصل 'الانساء یترشح بما فیہ' کا معاملہ ہے، یعنی ایک انسان جو حق کا متلاشی تھا، پھر اس کو خدا کی صورت میں حق مل گیا اور اس کا وہ حال ہوا جس کی تصویر قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے: او من کان میتا فاحیناہ، وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس۔ یعنی وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے (الانعام:123)

ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ذکر کثیر (الاحزاب:41) میں جینے لگتا ہے، یعنی ہر وقت خدا کو یاد کرنا، ہر وقت خدا کے بارے میں سوچنا، ہر لمحہ خدا کی تجلیات کا تجربہ کرنا۔ ایسا انسان گویا کہ اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنے کے لئے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہوتا

ہے۔ جب بھی کوئی خاص موقع اس کی زندگی میں پیش آتا ہے تو اس کے اندر چھپے ہوئے ربانی جذبات ایک طوفان بن کر ابل پڑتے ہیں۔ اس وقت وہ مخصوص قسم کے الہامی الفاظ میں خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ ایک تیار ذہن سے نکلنے والی اسی قسم کی الہامی دعا کا نام اسم اعظم کے ساتھ خدا کو پکارنا ہے۔

ایک صالح خاتون کا واقعہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم خفیہ طور پر حضرت موسیٰ کے دین پر ایمان لائی تھی۔ جب فرعون کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت غصہ ہوا اور اس کے قتل کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس وقت آسیہ کی زبان سے ایک دعا نکلی جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے: رب ابن لی عندک بیتا فی الجنه، ونجّنی من فرعون و عمله، ونجنی من القوم الظالمین۔ یعنی اے میرے رب، میرے لئے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھ کو فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور مجھ کو ظالم قوم سے نجات دے (التحریم:11)

یہ دعا ایک ایسی دعا ہے جسکے اندر اسمِ اعظم کی روح پوری طرح موجود ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آسیہ نے جب یہ دعا کی تو اس وقت موت سے پہلے اسکو یہ تجربہ ہوا کہ فرشتوں نے اسکو آخرت کی دنیا میں ملنے والا جنتی مکان اسکو دکھا دیا (القرطبی، جلد 18، صفحہ 203)۔

یہ بات یقینی ہے کہ آسیہ کی زبان سے یہ دعا اچانک یا اتفاقاً نہیں نکلی، بلکہ وہ اس کی پچھلی زندگی کے دوران پیش آنے والے تجربات کا نتیجہ تھی۔ اس دعا سے پہلے وہ ایک تیار شخصیت بن چکی تھی۔ وہ پہلے ہی سے ذکر اور دعا کے مخصوص لمحات میں جی رہی تھیں۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب فرعون کی سفاکی کا معاملہ پیش آیا تو اس کی زبان سے فطری طور پر مذکورہ قسم کے ربانی الفاظ نکل پڑے۔

ایک تاریخ مثال

سلطان عبدالرحمٰن الناصر (وفات: 961ء) اسپین (اندلس) کا ایک مسلم حکمراں تھا۔ اس نے پچیس سال کی محنت سے قرطبہ کے پاس ایک شان دار محل بنایا۔ یہ محل چار میل لمبی اور تین میل چوڑی زمین میں واقع تھا۔ اس محل کا نام اس نے الزّہرا رکھا۔ مگر غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو قصر الزہرا کے بجائے مدینۃ الزہرا کہا جانے لگا۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے الزہرا کے نام سے یہ شاہی بستی بسائی اور اس میں شان دار محل تعمیر کئے۔ ان تعمیرات کے آخری دنوں میں سلطان اتنا مشغول رہا کہ مسلسل تین جمعہ میں وہ مسجد نہ پہنچ سکا۔ چوتھے جمعہ کو جب سلطان جامع مسجد پہنچا تو اس کی موجودگی میں قاضی منذر (وفات: 966ء) نے جو خطبہ دیا' اس میں نام لئے بغیر سلطان پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

قاضی منذر نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں دنیا میں عمارتیں کھڑی کرنے اور آخرت سے غافل ہو جانے پر وعیدیں تھیں۔ مثلاً..... کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے ہو اور شان دار محل بناتے ہو گویا کہ تم کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور جب تم کسی پر حملہ کرتے ہو تو جبارانہ حملہ کرتے ہو۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو (الشعراء: 131-128)' تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کے رضا کی طلب پر رکھی ہو' یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی ہو اور وہ عمارت اس کو لے کر جہنم کی آگ میں جا گری۔ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے' ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی' یہاں تک کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم اور حکیم ہے (التوبہ: 110-109)

اسی طرح قاضی منذر نے اس مضمون کی بہت سی حدیثیں سنائیں اور ان کی تشریح کی۔

اپنے خطبے میں اگر چہ انہوں نے سلطان کا نام نہیں لیا، مگر مسجد کا ہر نمازی سمجھ رہا تھا کہ ان سخت تنقیدوں کا مخاطب کون ہے اور وہ کس کے اوپر پڑ رہی ہیں۔

تنقید، یوں بھی آدمی کے اوپر بہت سخت ہوتی ہے اور جب مجمعِ عام میں کسی پر تنقید کی جائے تو وہ اور بھی زیادہ ناگواری کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تنقید ایک ماتحت کی زبان سے اپنے حاکم کے اوپر اور جب کوئی حاکم اپنے ماتحت کو تنقید کرتے ہوئے سنتا ہے تو اس پر کبر کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے شریف اور دین دار لوگ بھی اس وقت قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مگر سلطان نے حد درجہ ضبط سے کام لیا۔ اگر چہ سلطان پر اس تنقید کا بہت زیادہ اثر تھا مگر وہ مسجد میں کچھ نہ بولا اور نماز کے بعد خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

گھر پہنچ کر سلطان نے اپنے لڑکے الحکم سے کہا کہ آج قاضی منذر نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ ان کے پیچھے کبھی جمعہ کی نماز نہیں پڑھوں گا۔ الحکم نے کہا: قاضی منذر کا امام ہونا یا نہ ہونا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ ان کو معزول کر دیجئے اور ان کی جگہ دوسرا کوئی امام مقرر کر دیجئے جو ایسی گستاخی نہ کرے۔ یہ سن کر سلطان غصہ میں آ گیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا: تمہارا برا ہو، ایک شخص جو ہدایت سے دور ہے اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہے کیا اس کی خوشی کی خاطر قاضی منذر جیسے خوبیوں والے آدمی کو معزول کر دیا جائے گا۔ یہ بات کبھی نہیں ہو سکتی (**ھذا مالا یکون**)۔

مجھے ان کی باتوں سے چوٹ لگی اس لئے میں نے ان کے پیچھے جمعہ نہ پڑھنے کی قسم کھا لی۔ میری خواہش ہے کہ اس قسم کے کفارہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ تاہم قاضی منذر ہماری زندگی میں اور اپنی زندگی میں لوگوں کو نماز پڑھاتے رہیں گے۔ (**بل یصلی بالناس حیاتنا و حیاتہ انشاء اللہ تعالیٰ**) چنانچہ قاضی منذر بدستور جمعہ کی نماز پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمٰن الناصر کے انتقال کے بعد اسکے لڑکے نے بھی ان کے مقام کو اسی طرح باقی رکھا۔

اوپر جس واقعے کا ذکر ہوا، اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی

انسان کی وہ مطلوب صفات کیا ہیں' جو اگر کسی کے اندر ہوں تو اس کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ وہ خدا سے ایسی دعا کر سکے جن کو اسمِ اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا کہا جاتا ہے۔

اسمِ اعظم کے ساتھ دعا میں اگر پچاس فی صد اسم اعظم کا حصہ ہے تو پچاس فی صد خود دعا کرنے والے کی ربّانی استعداد کا حصہ ہے۔ یہ ربّانی استعداد قاضی منذر اور سلطان عبدالرحمٰن دونوں کے اندر کم و بیش موجود تھی' اس لئے ان کے ساتھ ایک عظیم دعا کی تاریخ شامل ہوگئی۔ حسب ذیل واقعہ اس معاملے میں ایک چشم کشا مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

بارش شروع ہوگئی

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار اسپین میں قحط پڑا۔ بہت سخت حالات پیدا ہوگئے۔ سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا اور درخواست کی کہ آپ استسقاء کی نماز پڑھائیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش برسائے۔ قاضی منذر نے سلطان کے قاصد سے پوچھا کہ سلطان نے میرے پاس دعا کا پیغام بھیجا ہے مگر وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے کہا: آج سے زیادہ ہم نے کبھی ان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں پایا۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہیں۔ تنہائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ مٹی کے فرش پر سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے تھے اور اللہ سے کہہ رہے تھے: خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے' کیا تو میرے گناہوں کی وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا' حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (هٰذه ناصيتی بيدک' اتراک تعذب بی الرعية وانت ارحم الراحمين)

یہ سن کر قاضی منذر کے چہرے پر اطمینان ظاہر ہوگیا۔ انہوں نے قاصد سے کہا: اپنے

ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ اب ضرور بارش ہوگی۔ کیوں کہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قاصد واپس ہو کر گھر پہنچا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ (الکامل فی التاریخ، جلد 8، صفحہ 675)۔

زمین پر خشک سالی اس لئے آتی ہے، تاکہ آنکھوں کی خشک سالی ختم ہو۔ آسمان پر بادل اس لئے گرجتے ہیں، تاکہ لوگوں کے دل میں خدا کے خوف سے دہلیں۔ گرمی کی شدت اس لئے ہوتی ہے، تاکہ لوگ جہنم کی آگ کو یاد کر کے تڑپ اٹھیں۔

اس طرح کے واقعات کا نہایت گہرا تعلق، اسماءِ حسنیٰ اور اسمِ اعظم کے معاملے سے ہے۔ یہی وہ واقعات ہیں جو انسان کے اندر ربّانی کیفیات کی پرورش کرتے ہیں، اور جس سینے کے اندر ربّانی کیفیات کا یہ چشمہ جاری ہو جائے، وہی وہ انسان ہے جس کو اسماءِ حسنیٰ کی معرفت ہوتی ہے اور اسی کو یہ توفیق ملتی ہے کہ وہ اسمِ اعظم کے ساتھ خداوند عالم کو پکارے اور اس کی پکار ضرور سنی جائے۔

ذاتی تجربہ

خدا کے فضل سے مجھ کو اس قسم کے تجربے بار بار پیش آئے ہیں۔ 30 دسمبر 2006ء کو میں اپنی ٹیم (سی پی ایس) کے کچھ افراد کے ساتھ نئی دہلی کے لودھی گارڈن میں گیا۔ یہ گویا کہ ہماری اسپریچول آؤٹنگ (spiritual outing) تھی۔ اس موقع پر میرے دل سے ایک دعا نکلی، جو میری فہم کے مطابق، اسم اعظم کے ساتھ دعا کی ایک مثال ہے۔

جب ہم لوگ لودھی گارڈن کے اندر پہنچ گئے تو میں نے اپنی ٹیم کے افراد سے پوچھا کہ آپ لوگ جب یہاں پہنچے تو آپ کا پہلا احساس کیا تھا۔ لوگوں نے مختلف انداز سے اپنے اپنے تجربے بتائے۔ پھر میں نے کہا کہ جب میں اس خوبصورت گارڈن کے اندر داخل ہوا تو

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ میں جنت کو دور سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ خوبصورت گارڈن میرے لئے جنت کا ایک بعید تعارف بن گیا۔

میں نے اشک بار آنسوؤں کے ساتھ کہا کہ خدایا' تو نے مجھے ناقص جنت میں پہنچادیا' اب تو اپنی رحمت سے مجھے کامل جنت میں بھی داخل کردے۔ میں نے کہا کہ خدایا' میں اور میرے ساتھی' پوری انسانی تاریخ میں' جنت کیلئے سب سے زیادہ غیر مستحق لوگ (least deserving candidates) ہیں۔ اگر تو ہمارے کامل عدم استحقاق کے باوجود ہم کو اپنی جنت میں داخل کردے تو یہ واقعہ تیری شانِ رحمت کے ایک نئے اظہار کے ہم معنیٰ ہوگا۔ سارے زمین اور آسمان اور تمام فرشتے یہ دیکھ کر حیران ہوجائیں گے کہ خدا کی رحمتوں کا سمندر اتنا وسیع تھا کہ ہمارے جیسے آخری حد تک غیر مستحق افراد بھی تیری رحمتِ بے پایاں کے فیض سے محروم نہ رہے' تیری رحمتِ بے پایاں کتنی وسیع تھی کہ وہ تاریخ کے ان نااہل ترین افراد تک کا احاطہ کررہی تھی۔

لقد أوتیت سولک یا موسیٰ

غالباً 1962ء کی بات ہے۔ مجھے اعظم گڑھ کے ایک قصبہ (اَن جان شہید) کے ایک اجتماع میں شرکت کا موقع ملا۔ اس اجتماع میں مسلم حضرات شریک تھے۔ مجھے پیشگی طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ مجھ کو اس اجتماع میں خطاب کرنا ہے۔ کچھ لوگوں نے اچانک مجھے اسٹیج پر لے جا کر کھڑا کردیا۔ میرے لئے یہ ایک مجبورانہ خطاب کا معاملہ تھا۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا جب کہ مجھے خطاب کے معاملے میں کامل عجز کا تجربہ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے بار بار اجتماعات میں خطاب کیا تھا' مگر یہ تمام خطابات تحریری مقالے کی صورت میں تھے۔ مجھے پیشگی طور پر پروگرام کا علم ہوتا تھا اور میں مقالہ لکھ کر اس کو وہاں پڑھ دیتا تھا۔

مگر اس بار ایسی صورت پیش آئی کہ مجھے لازمی طور پر بولنا بھی تھا اور کسی پیشگی تیاری کے

بغیر زبانی طور پر خطاب کرنا تھا۔اس وقت اچانک میرے اندر وہ ذہنی بھونچال کی کیفیت پیدا ہوئی جس کو نفسیاتی اصطلاح میں برین اسٹارمنگ (brain storming) کہا جاتا ہے۔اس وقت میرے لئے کسی آزادانہ انتخاب کا موقع نہ تھا۔

میں نے خدا کو یاد کیا اور دیوانگی کے عالم میں اچانک بولنا شروع کر دیا۔حاضرین کے سامنے مائک پر بولتے ہوئے میں نے کہا کہ.....قرآن میں پیغمبروں کے قصے بتائے گئے ہیں، لیکن یہ تاریخی کہانی کے طور پر نہیں، بلکہ وہ ہمارے حال کے لئے ایک زندہ سبق کی حیثیت رکھتے ہیں۔اسی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ وہ مصر کے جابر بادشاہ کے دربار میں جائیں اور وہاں اس کے سامنے توحید کی دعوت پیش کریں۔

حضرت موسیٰ نے کہا کہ: یضیق صدری ولا ینطق لسانی ۔خدایا، میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں (الشعراء:13)۔پھر انہوں نے قادرِ مطلق خدا کی توفیق سے یہ دعا کی کہ:رب اشرح لی صدری، ویسرلی امری، احلل عقدة من لسانی، یفقهوا قولی (اے میرے رب، میری لئے میرا سینہ کھول دے اور میرے لئے میرا معاملے کو آسان کر دے۔اور تو میرے زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو سمجھیں (طٰہٰ:28-25)

میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے جب اس طرح خدائے سمیع وبصیر کو پکارا تو ان کی دعا سیدھے عرش الٰہی تک پہنچ گئی اور وہاں سے آواز آئی:لقد أوتیت سولک یا موسیٰ۔ یعنی اے موسیٰ، تم نے جو سوال کیا، وہ تم کو دے دیا گیا (طٰہٰ:36)

اس کے بعد میں نے دیوانگی کے عالم میں کہا کہ یہ واقعہ کوئی ماضی کی سرگزشت نہیں، یہ واقعہ آج بھی اسی طرح زندہ ہے، جس طرح خدائے حی وقیوم زندہ موجود ہے۔آج بھی اگر کوئی خدا کا بندہ خدا کو پکارے اور کہے کہ خدایا، میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی

نہیں تو آج بھی اس کی یہ آواز خدائے سمیع و بصیر تک پہنچے گی اور وہاں سے آواز آئے گی کہ اے میرے بندے، تم نے جو سوال کیا وہ تم کو دے دیا گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور میری آنکھ سے آنسو نہ تھمنے والے مینہ کی طرح برس رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے بے اختیارانہ انداز میں بولنا شروع کیا اور مسلسل بولتا رہا۔

یہ واقعہ میرے لئے اس معاملے میں ایک بریک تھرو (breakthrough) کی مانند تھا۔ اس کے بعد میں نے تقریری مقالہ لکھنا چھوڑ دیا اور برجستہ انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے انڈیا کے اندر اور انڈیا کے باہر سینکڑوں اجتماعات میں شرکت کی اور لمبی لمبی تقریریں کیں۔ یہ بلاشبہہ اَن جان شہید کے اجتماع والی دعا کا کرشمہ تھا۔

میری سمجھ کے مطابق، یہ دعا اسم اعظم کے ساتھ کی ہوئی دعا تھی۔ اس سے پہلے میں گویا ایک بے زبان انسان تھا۔ میرے مرحوم عزیز مولانا اقبال احمد سہیل (وفات: 1955) مجھ کو بچپن میں ''مرزا پھویا'' کہا کرتے تھے۔ مذکورہ واقعے کے بعد میں جس طرح اجتماعات میں بولنے لگا، اس کی کوئی بھی توجیہ دعا کے سوا نہیں کی جا سکتی۔

تو میرے لئے پلے بیک اسپیکر بن جا

ایک بار میں ایک مغربی ملک کے سفر پر تھا۔ اس دوران مجھے ایک اجتماع میں خطاب کیلئے بلایا گیا۔ بلانے والے نے مجھ سے یہ نہیں بتایا تھا کہ مجمع کی نوعیت کیا ہوگی، اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہوگا۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے ذہن میں یہ آ گیا کہ وہاں ہندوستان اور پاکستان کے لوگ ہوں گے اور مجھے وہاں اردو میں خطاب کرنا ہوگا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھرے ہال میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دریافت کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ سب انگریزی داں

لوگ ہیں۔ان کو مجھے انگریزی میں خطاب کرنا ہے' کیونکہ وہ لوگ اردو نہیں سمجھ سکتے۔یہ خبر میرے لئے ایسی تھی جیسے کسی کے اوپر اچانک بجلی گر جائے۔اس سے پہلے میں نے انگریزی زبان میں پیشگی طور پر تیار کئے ہوئے مقالے پڑھے تھے' لیکن برجستہ طور پر انگریزی میں میں نے کبھی خطاب نہیں کیا تھا۔

ہال کے ساتھ وہاں ایک سائڈ روم تھا۔میں سراسیمگی کے عالم میں اس سائڈ روم میں گیا۔میں نے اندر سے دروازے کو بند کرلیا۔اور وضو کر کے دو رکعت صلوٰۃ الحاجت پڑھی۔ اس کے بعد میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میری آنکھوں سے آنسو اس طرح بہہ رہے تھے جیسے کہ پانی کا نل کھل گیا ہو۔

میں نے روتے ہوئے کہا کہ خدایا' یہاں ایک عاجزِ مطلق کو قادرِ مطلق کی ترجمانی کرنی ہے۔آپ اگر چاہیں تو پتھروں کو حکم دیں اور وہ چلا کر آپ کی بات کا اعلان کریں۔آپ اگر حکم دیں تو درخت اپنی خاموشی کو توڑ کر انسانوں سے خطاب کریں۔اگر آپ حکم دیں تو زمین اور آسمان' وہ سب کچھ بولیں جو انسان کو بولنا تھا' مگر وہ نہ بول سکا۔لیکن خدایا' آپ خود اپنے قانونِ امتحان کی بنا پر ایسا نہیں کر سکتے۔اس لئے آپ کے سامنے اس کے سوا کوئی اور انتخاب نہیں کہ آپ میرے جیسے عاجز انسان کی وہ مدد کریں جو اس سے پہلے آپ نے کسی اور کی نہیں کی۔

خدایا' میں آپ کے تمام اسماءِ حسنیٰ کا واسطہ دے کر آپ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ میرے لئے پلے بیک اسپیکر (playback speaker) بن جائیں۔آپ بولتے جائیں اور میں اس کو دہراتا جاؤں۔آپ خاموشی کی زبان میں مجھ کو بتائیں اور میں نطق کی زبان میں اس کو دوسروں کے سامنے پیش کروں۔خدایا' اگر میں اس موقع پر نہ بولوں تو یہ میرے لئے 'فرار من الزحف' کے ہم معنیٰ ہوگا۔اور اگر آپ میری مدد نہ کریں تو اس بات کا اعلان نہ ہو سکے

گا جس کا اعلان آپ کی سب سے زیادہ مطلوب چیز ہے۔ خدایا' یہ وہ لمحہ ہے جب کہ نہ میرے لئے کوئی دوسرا انتخاب ہے اور نہ آپ کے لئے کوئی دوسرا انتخاب۔ خدایا' وہ لمحہ ہے جب کہ بندے کا عجز اور خالق کی قدرت دونوں ایک سطح پر آ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں نہ میرے لئے واپسی کا موقع ہے اور نہ آپ کیلئے مجھ کو نظر انداز کرنے کا موقع۔

یہ دعا کر کے میں باہر آیا اور ہال کے اندر مقرر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پورا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں صرف مجھ کو تقریر کرنا تھا۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں بولنا شروع کیا۔ اور تقریر ایک گھنٹے تک انگریزی میں بولتا رہا۔ میں نے پوری تقریر برجستہ طور پر اور روانی کے ساتھ کی۔ تقریر کے خاتمے پر اعلان کیا گیا کہ کوئی صاحب سوال کرنا چاہیں تو سوال کر سکتے ہیں' لیکن مجمع کی طرف سے کوئی سوال نہ آیا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ تمام لوگ آپ کی انگریزی تقریر سے اس قدر مسحور تھے کہ وہ اپنے اندر سوال کرنے کی جرأت نہ پا سکے۔

اس تجربے کے بعد میری زندگی میں غیر متوقع طور پر ایک نیا دور آیا' جب کہ میں برجستہ طور پر انگریزی زبان میں بولنے لگا۔ انگریزی میں گفتگو' انگریزی میں انٹرویو' انگریزی میں تقریر۔ یہ سب جو اس سے پہلے میری زندگی میں موجود نہ تھا' اب وہ عمومی طور پر میری زندگی میں شامل ہو گیا اور بفضلہٖ تعالیٰ تادمِ تحریر (30 اگست 2007ء) جاری ہے۔

آزادیٔ ہند (1947) کے بعد جب میں نے خصوصی طور پر انگریزی سیکھنا شروع کیا تو ہر ایک میری حوصلہ شکنی کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی (عبدالعزیز خاں) نے میرے انگریزی شوق کو دیکھ کر کہا تھا: بڈھا طوطا کیا پڑھے گا۔ عام تجربے کے لحاظ سے' ان کا ایسا کہنا بالکل درست تھا۔ لیکن خدا کی نصرت سے وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جو انسان سے نہیں ہو سکتا۔ میرے گمان کے مطابق' مذکورہ دعا بلاشبہہ اسم اعظم کے ساتھ کی جانے والی دعا تھی اور اسی دعا کا یہ کرشمہ تھا کہ ایک نہ ہونے والی بات واقع بن کر لوگوں کے سامنے آ گئی۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

پروفیسر محمد مجیب (وفات:1985) جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے تین بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ بقیہ دو یہ تھے: ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات: 1969)' ڈاکٹر عابد حسین (وفات:1978)۔ پروفیسر مجیب نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان کو انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت تھی۔ انہوں نے مستشرقین (orientalsits) کا لٹریچر تفصیل کے ساتھ پڑھا تھا۔

غالباً 1970 کی بات ہے۔ میں جامعہ ملیہ کے کیمپس میں پروفیسر مجیب سے ملا۔ اس وقت پروفیسر انور علی خان سوز (وفات:1987) بھی میرے ساتھ تھے۔ گفتگو کے دوران پروفیسر مجیب نے خاص انداز میں مجھ سے کہا: مولوی صاحب' آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلام کی نمائندگی یہودی اسکالر کر رہے ہیں۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ زمانے میں ایک نیا اسلوبِ تحریر پیدا ہوا ہے۔ اس اسلوبِ تحریر میں' مسلم علماء اسلامی لٹریچر تیار نہ کر سکے۔ البتہ تعلیم یافتہ یہودیوں نے یہ کام کیا۔ انہوں نے وقت جدید اسلوب میں اسلام کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں اگرچہ اسلام کی تعلیمات کو بگڑی ہوئی صورت میں پیش کیا گیا ہے' لیکن اسلوبِ تحریر کے اعتبار سے وہ وقت سے اسلوب میں ہیں۔ اس لئے آج جو تعلیم یافتہ لوگ انگریزی زبان میں اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں' وہ اکثر انہیں یہودی علما کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

میں پروفیسر مجیب کی باتوں کو سنتا رہا۔ میں نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا' لیکن ان کی بات کو سن کر میرے دماغ میں ایک بھونچال آ گیا۔ میں خاموشی کے ساتھ واپس آ گیا اور پھر رات دن یہ دعا کرنے لگا کہ خدایا' مجھے توفیق دیجئے کہ میں آپ کے دین کو آج کے اسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کر سکوں' میں عصری اسلوب میں اسلام کا لٹریچر تیار کر سکوں۔

میں اکثر کسی واقعے کا حوالہ دے کر دعا کرتا ہوں۔ اس معاملے میں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ اصل یہ ہے کہ آزادی کے بعد یوپی میں خاتمۂ زمین داری کا قانون (zamindari

(abolition act نافذ ہوا۔ نیشنل گورنمنٹ کے تحت' یہ قانون اس اصول پر مبنی تھا کہ.....جو جوتے' اس کا کھیت۔

میرا خاندان یوپی کے اعظم گڑھ سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارا خاندان وہاں کے بڑے زمین داروں میں سے ایک تھا۔ ہماری زمینیں زیادہ تر کسانوں کو دی ہوئی تھیں' جوان کو جوتتے تھے اور لگان ادا کرتے تھے۔ خاتمۂ زمین داری کے قانون کے مطابق' زمین دار کو اس کی زمین واپس ملنے کی صرف ایک ہی صورت تھی' وہ یہ کہ زمین کو جوتنے والا کسان تحریری طور پر زمین سے استعفادے دے۔

ہماری بیش تر زمینیں کسانوں کے پاس تھیں۔ یہ کسان سب کے سب ہندو لوگ تھے۔ ہماری زمیں داری کے منیجر بھی ایک ہندو تھے' جن کا نام بھاؤرام تھا۔ بھاورام ہمارے خاندان کے نہایت وفادار ملازم تھے۔ انہوں نے ایک طوفانی مہم چلادی کہ تمام کسان جو ہماری زمینوں کو جوتتے ہوئے تھے وہ تحریری استعفادے دیں۔ بھاؤرام نے اپنی رات دن کی کوشش سے ایک ایک کسان سے استعفا لکھوالیا۔ ہمارے ساتھ استثنائی طور پر ایسا ہوا کہ ہمارا کوئی بھی کھیت ایسا نہ بچا جس کا تحریری استعفا حاصل نہ کرلیا گیا ہو۔

اس زمانے میں بھاؤرام پر ایک دیوانگی طاری تھی۔ وہ ہم لوگوں سے کہتے تھے کہ: بابو' جم داری میں داگ نہ لگنے پائے (بابو' زمین داری میں داغ لگنے نہ پائے) میں اس واقعے کے حوالے سے خدا سے دعا کرنے لگا۔ میں روتا تھا اور کہتا تھا کہ خدایا' تیرے دین میں ایک داغ لگ رہا ہے۔ تیرا دین اس اسلوب میں پیش نہیں ہو رہا ہے جو آج کے جدید ذہن کو ایڈریس کرسکے۔ تو مجھے توفیق دے کہ میں تیرے دین کے اس داغ کو ہٹاؤں' میں وقت کے اسلوب میں اسلام کو پیش کرسکوں۔ میں بے قرار دل اور اشک بار آنسوؤں کے ساتھ یہ دعا کرتا تھا اور رات دن اپنی تیاری میں مشغول رہتا تھا۔

اس زمانے میں میری بے قراری کا عالم یہ تھا کہ ایک بار میں دلی پبلک لائبریری میں

گیا۔ وہاں کے ریفرنس سیکشن میں جا کر ریفرنس کی کتابوں کو پڑھنے لگا۔ اس وقت میری محویت کا یہ عالم تھا کہ میں قریب کی کرسی پر نہ بیٹھ سکا۔ میں الماری کے سامنے کھڑا تھا اور کتابیں نکال نکال کر پڑھ رہا تھا۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ مجھ سردی لگ گئی اور میں بیمار ہو کر تقریباً دو مہینے تک بستر پر پڑا رہا۔

آج جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خدا کی توفیق سے تقریباً ہر اسلامی موضوع پر اتنی کتابیں لکھی ہیں، جو ایک تعلیم یافتہ انسان کے لئے وقت کے اسلوب میں اسلام کا مؤثر تعارف پیش کرتی ہیں۔ مشرق اور مغرب دونوں جگہ کے اہل علم نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

لوگوں کا یہ تاثر یہاں تک پہنچا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں نے میرے لٹریچر کو پھیلانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ امریکا میں مقیم کچھ لوگ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے ذاتی جذبے کے تحت، میری تمام کتابوں اور ماہ نامہ الرسالہ کو انٹرنیٹ کے ویب سائٹ پر ڈال دیا ہے۔ اب دنیا کے کسی بھی حصہ میں کوئی آدمی میری تحریروں کو اردو اور انگریزی میں انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھ سکتا ہے۔

اسی طرح مصر کے کچھ عرب حضرات میری کتابوں کو انٹرنیٹ پر ڈال رہے ہیں۔ انشاء اللہ، اب ہر جگہ میری عربی کتابیں بھی انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھی جا سکیں گی۔ اس کے علاوہ، انڈیا میں ایک پوری ٹیم نے اپنے آپ کو اس مشن کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کام اب ہر دن عالمی سطح پر پھیل رہا ہے۔ اسی طرح کچھ تعلیم یافتہ لوگوں نے اس لٹریچر کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ انہوں نے محض ذاتی جذبے کے تحت، میری اردو اور انگریزی تقریروں کو ٹی وی کے پروگرام میں شامل کر دیا۔ فجزاهم الله خير الجزاء۔

''عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر'' کا وجود میں آنا بلا شبہہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔

میرے جیسے عاجز اور بے حقیقت آدمی کے ذریعہ یہ واقعہ پیش آیا۔اس واقعے کی اس کے سوا کوئی اور توجیہہ ممکن نہیں کہ اسمِ اعظم کی دعا جو میرے بے قرار دل سے نکلی، اس کو خدا نے قبول فرمایا اور اس طرح اسلام کے جدید تعارف کا وہ واقعہ پیش آیا جو میرے جیسے انسان کے لئے ناقابلِ تصور تھا۔

ایک واقعہ

24 اکتوبر 2005 کا واقعہ ہے۔ یہ عید کا دن تھا۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نئی دہلی کی ایک مسجد میں عید کی نماز ادا کرنے گیا۔ وہاں میں مسجد کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ میں مسلسل رو رہا تھا اور بے قراری کے عالم میں دل کی زبان سے دعا کر رہا تھا۔ میری اس حالت کو مولانا محمد ذکوان ندوی نے دیکھا۔ بعد کو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا کیا معاملہ تھا۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ مجھے وہ حدیث یاد آئی، جس میں عید الفطر کے دن نماز کے لئے نکلنے والے اہلِ ایمان کا ذکر ہے۔ وہ حدیث اس طرح ہے:

".....فاذا کان یوم عید هم، یعنی یوم فطر هم، باهی بهم ملائکة، فقال: ملائکتی، ماجزاء اجیر وفی عمله ۔ قالوا: ربنا، جزائه ان یوفی اجره ۔قال: ملائکتی، عبیدی وامائی قضوا فریضتی علیهم، ثم خرجوا یعجون الی الدعاء، وعزتی وجلالی وکرمی وعلوی وارتفاع مکانی لا جینهم ۔فیقول: ارجعوا فقد غفرت لکم، وبدلت سیئاتکم حسنات ۔ قال: فیرجعون مغفورٌ لهم ۔ (رواه البیهقی فی شعب الایمان، مشکوٰة المصابیح، رقم الحدیث: 2096)۔

ترجمہ: جب ان کی عید کا دن آتا ہے، یعنی عید فطر کا دن، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے ان پر فخر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے میرے فرشتو! اس عامل کا اجر کیا ہے جس نے اپنے عمل کو پورا کر دیا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، اس کی جزا یہ ہے کہ اس کو اس کے عمل کا پورا

بدلہ دے دیا جائے۔ خدا کہتا ہے کہ اے میرے فرشتو' میرے بندوں اور میری بندیوں نے میرے اس فرض کو ادا کر دیا جو ان پر تھا' پھر وہ نکلے ہیں دعا کے ساتھ مجھ کو پکارتے ہوئے۔ میری عزت اور میرے جلال کی قسم' میرے کرم' میرے علوِ شان اور میرے بلند مقام کی قسم' میں ضرور ان کی پکار کو سنوں گا۔ پھر خدا کہتا ہے کہ: تم لوگ واپس جاؤ' میں نے تم کو بخش دیا اور میں نے تمہارے سیئات کو حسنات میں بدل دیا۔ پس وہ لوگ اس طرح لوٹتے ہیں کہ ان کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔

آج کے دن کی نسبت سے یہ حدیث مجھے یاد آئی۔ یہ سوچ کر میرا دل بے قرار ہو گیا کہ آج کے دن خدا لوگوں کو بڑے بڑے انعام دے رہا ہے' لیکن یہ انعام عمل کرنے والوں کے لئے ہے اور میرے پاس کوئی عمل نہیں۔

پھر مجھ کو سرسید احمد خاں (وفات: 1898) کا ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ اپنے محمڈن کالج (موجودہ علی گڑھ یونیورسٹی) کے چندے کے لئے ایک مسلم نواب کے یہاں گئے۔ نواب صاحب سرسید کے بعض خیالات پر ان سے بہت غصہ تھے۔ انہوں نے سرسید سے ملنے سے انکار کر دیا' مگر سرسید مایوس نہیں ہوئے۔ ان کو معلوم تھا کہ شام کو نواب صاحب اپنی گھوڑا گاڑی پر سیر کے لئے نکلتے ہیں۔ اس وقت ان کی کوٹھی کے سامنے بھکاری لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ نواب صاحب ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتے ہوئے آگے چلے جاتے ہیں۔

سرسید شام کے وقت وہاں پہنچے اور بھکاریوں کی صف میں اس طرح بیٹھ گئے کہ اپنی ٹوپی کو کاسۂ گدا کی طرح اپنے سامنے رکھ لیا۔ نواب صاحب حسبِ معمول اپنی گھوڑا گاڑی پر نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ سرسید بھکاریوں کی صف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر نواب صاحب کو تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ سید تم یہاں کہاں۔ سرسید نے جواب دیا کہ..... نواب صاحب' اگر آپ مجھے چندہ نہیں دے سکتے تو بھیک تو دے سکتے ہیں۔ اس بات کا نواب صاحب پر بہت اثر پڑا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر پڑے اور سرسید کو لے کر اپنی کوٹھی کے اندر گئے۔ ان کو عزت کے ساتھ بٹھایا اور ان کو کالج کے لئے کافی چندہ دیا۔

میں نے اس واقعے کو لے کر کہا کہ خدایا' اگر میں عمل کی بنیاد پر کچھ پانے کا مستحق نہیں تو بھیک کے طور پر مجھے اپنا انعام عطا کر دے' کیونکہ تو نے قرآن میں جس طرح عامل کو عطیہ کا مستحق قرار دیا ہے' اسی طرح تو نے سائل کو بھی عطیہ کا مستحق بنایا ہے۔ اگر تو انسان سے یہ چاہتا ہے کہ وہ عامل کو دینے کے ساتھ سائل کو بھی دے تو یقیناً میں امید کر سکتا ہوں کہ تو خود بھی میرے ساتھ اسی طرح کا معاملہ فرمائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اسم اعظم کے ساتھ کی دعا کی ایک مثال ہے' جس کی توفیق مجھے خدا کی خصوصی رحمت کے تحت حاصل ہوئی۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے' اسمِ اعظم کے ساتھ دعا نہ تو کسی یاد کئے ہوئے الفاظ کو دہرانے کا نام ہے اور نہ خود انسان پیشگی طور پر سوچ کر اس قسم کی دعا کر سکتا ہے۔ اس قسم کی دعا براہ راست خدا کی توفیق سے ہوتی ہے اور وہ اچانک ہی انسان کے سینے سے ابل پڑتی ہے' جیسے کوئی جوالہ مکھی پہاڑ اچانک پھٹ پڑے' حالانکہ موسمیات کے ماہرین نے اس کی پیشن گوئی نہ کی ہو۔

نصرت الٰہی کا اصول

ایک شخص مقامِ اضطرار پر ہو تو صرف دعا کے کلمات ہی نصرتِ الٰہی کو کھینچنے کیلئے کافی ہیں۔

امن یجیب المضطر اذادعاہ و یکشف السوء (سورہ النمل ۶۲)

ترجمہ: کون ہے جو بے بس کی پکار کو سنتا ہے۔ اور اس کے دکھ کو دور کر دیتا ہے۔

مگر جو شخص یا گروہ مقامِ اضطرار پر نہ ہو بلکہ اس کو جدوجہد کے مواقع بھی حاصل ہوں' اس کے لئے دعا کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنی دعا کے موافق عمل کرے۔

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ (سورہ فاطر ۱۰)

ترجمہ: اس کی طرف چڑھتے ہیں کلمات پاکیزہ اور عمل صالح اس کو بلند کرتا ہے۔

دعا کے موافق عمل کیا ہے' یہ اس دعا سے متعین ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں نصرت کو طلب کرنے کیلئے آدمی مانگ رہا ہو..... اگر کوئی شخص قرآن کے اسرارِ حکم جاننے کی دعا کر رہا ہو تو اس کیلئے اس دعا کے موافق عمل یہ ہوگا کہ وہ کتابِ الٰہی میں تدبر کرے۔ کوئی شخص نصرتِ معاش کا طلب گار ہے تو اپنی دعا کے ساتھ اس کو معاش کی راہوں میں اپنی ممکن جدوجہد صرف کرنی ہوگی۔ اغیار کے خلاف نصرتِ رعب مطلوب ہے تو اپنے درمیان اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔ اعدائے اسلام پر نصرت فتح کی دعا کی جارہی ہے تو اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ ان کے اوپر دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا جائے اور اس کو اتمام حجت کی حد تک لے جانے کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی گروہ کو پوری طرح آگاہ کرنے سے پہلے ہلاک نہیں کرتا۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ اہل اسلام اگر ۲۰ ہوں تو اہل باطل کے ۲۰۰ پر غالب آئیں گے۔ مگر ضروری ہے کہ دونوں کے گروہوں کے درمیان یہ فرق باعتبار کمیت ہو نہ کہ باعتبار نوعیت۔ یعنی اہل باطل جس چیز میں ''دوسو'' ہوں' اہل حق کو اسی چیز میں ''بیس'' ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہو کہ ایک طرف دوسو بندوقیں ہوں اور دوسری طرف بیس تلواریں تو یہ وعدہ متحقق نہ ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں فرق کمیت کا نہ رہا' نوعیت کا ہوگیا۔ اسی طرح اگر اہل اسلام کے پاس روایتی علم ہو اور اہل باطل کے پاس سائنسی علم۔ اہل اسلام جوش سے مسلح ہوں اور اہل باطل نے ہوش کا خزانہ جمع کر رکھا ہو' اہل اسلام کے پاس زمانہ سے بے خبری ہو اور اہل باطل کے پاس زمانہ سے آگاہی' اہل اسلام کے پاس اختلاف کا سرمایہ ہو اور اہل باطل کے پاس اتحاد کا۔ اہل اسلام کے پاس بے تربیتی ہو اور اہل باطل کے پاس منصوبہ بندی' اہل اسلام قدیم قوتوں کے مالک ہوں اور اہل باطل جدید قوتوں کے' تو اہل اسلام کو کبھی یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ وہ

اپنے حریف کے مقابلے میں نصرتِ خداوندی کے مستحق قرار پاسکتے ہیں۔ کیونکہ ان تمام ضرورتوں میں دونوں گروہوں کے درمیان نوعی فرق ہے اور جب نوعی فرق پایا جائے تو کسی بھی تعداد پر کوئی نصرت نازل نہیں ہوتی۔ جب بھی ایسا ہو کہ دونوں گروہوں کے درمیان فرق باعتبار نوعیت ہو جائے تو اہل اسلام کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اس کو ختم کر کے کمیت کی سطح پر لے آئیں۔ اس کے بعد ہی وہ نصرت الٰہی کے مستحق قرار پاسکتے ہیں۔

دعا یا کرتب

ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کیلئے ملازمت کا فارم بھرے تو اس کا نام درخواست ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے کھڑا ہو جائے اور یہ یقین کرے کہ اسی حال میں سات دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی، تو یہ کرتب ہے۔ درخواست دینا ایک بالکل معقول بات ہے۔ مگر کرتب اتنی ہی بے معنی چیز ہے۔ اسی طرح خدا سے مانگنے میں بھی ایک دعا کا طریقہ ہے اور دوسرا کرتب کا طریقہ۔ دعا یہ ہے کہ آدمی اپنے حاجات و مسائل میں خدا کی طرف رجوع کرے اور روئے گڑگڑائے، اس سے حاجت روائی کی درخواست کرے۔ یہ عین مطلوب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی خدا سے مانگو۔ مگر کچھ لوگوں نے اسی کے ساتھ کرتب کے کچھ طریقے نکال رکھے ہیں..... فلاں لفظ اتنی بار دہرا دو تو بلا ٹل جائے گی، فلاں وقت میں فلاں عمل کر لو تو حاجات پوری ہو جائیں گی۔ فلاں نقش کاغذ پر لکھ کر اتنے دن تک باندھے رہو تو دشمن ختم ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کرتب ہیں۔ دعا (اللہ کو پکارنا) جتنا بامعنی ہے، کرتب (عملیات) کے طریقے اتنے ہی بے معنی ہیں۔ پہلا عین اسلامی ہے اور دوسرا قطعاً غیر اسلامی۔

ننانوے اسماءِ حسنیٰ

1	اللّٰہ	2	الرّحمٰن	3	الرّحیم	4	الملِک	5	القدّوس
6	السّلام	7	المؤمن	8	المُھَیمن	9	العزیز	10	الجبّار
11	المتکبّر	12	الخالق	13	الباری	14	المصوّر	15	الغفّار
16	القھّار	17	الوھّاب	18	الرزّاق	19	الفتّاح	20	العلیم
21	القابض	22	الباسط	23	الخافض	24	الرّافع	25	المُعِزّ
26	المُذِلّ	27	السّمیع	28	البصیر	29	الحَکَم	30	العدُل
31	اللطیف	32	الخبیر	33	الحلیم	34	العظیم	35	الغفور
36	الشکور	37	العلی	38	الکبیر	39	الحفیظ	40	المُقیت
41	الحسیب	42	الجلیل	43	الکریم	44	الرّقبیب	45	المجیب
46	الواسع	47	الحکیم	48	الودود	49	المجید	50	الباعث
51	الشھید	52	الحق	53	الوکیل	54	القویّ	55	المتین
56	الولیّ	57	الحمید	58	المُحصی	59	المُبدی	60	المعید
61	المحیی	62	المُمیت	63	الحیّ	64	القیّوم	65	الواجد
66	الماجد	67	الواحد	68	الصّمد	69	القادر	70	المقتدر
71	المُقدّم	72	المؤخّر	73	الاوّل	74	الآخر	75	الظاھر
76	الباطن	77	الوالی	78	المتعالی	79	البَرّ	80	التّواب
81	المُنتقِم	82	العفُوّ	83	الرّءُوف	84	مالک الملک	85	ذوالجلال والاکرم
86	المُقسط	87	الجامع	88	الغنیّ	89	المُغنی	90	المانع
91	الضّارّ	92	النّافع	93	النّور	94	الھادی	95	البدیع
96	الباقی	97	الوارث	98	الرّشید	99	الصّبور		

(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ' جلد 11 ' صفحہ 220)

اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ يَرۡفَعُهٗ (سورہ فاطر۔۱۰)

ترجمہ: اس کی طرف پاکیزہ کلام چڑھتا ہے اور عمل صالح اس کو اوپر اٹھاتا ہے۔

اسمِ اعظم کسی ''لفظ'' کا نام نہیں ہے، بلکہ ''کیفیت'' کا نام ہے۔ کیفیتِ اعظم کے ساتھ جو دعا کی جائے وہی اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ یہ دراصل آپ کی اپنی قلبی کیفیت ہے جو کسی دعا کو اسمِ اعظم کی دعا بناتی ہے۔ کسی انسانی لفظ میں یہ طاقت نہیں کہ وہ خدا کا اسمِ اعظم بن جائے، وہ خدا کی لامحدود ہستی کا احاطہ کرلے۔

Compiled by:
Abdullah Burmi

مرتب:
عبداللہ برمی

Positive Thinkers Forum
No.9, 2nd Cross, Model Colony,
Yeshwanthapur, Bangalore - 22
Tel: 080-23376184 Cell: 09342899616
positivethinkersforum@rediffmail.com

Rs.60/-